

# روحِ عذابِ قبر اور سماعِ موتی

مختلف مکاتب فکر کے معترضین کے دلائل کا مکمل و مدلل جائزہ

تصنیف

مولانا عبدالرحمن کیلانی

مکتبۃ السلام سٹریٹ ٹرسٹ پورہ لاہور

# روحِ غدا بُقبر و سماعِ موتی

مختلف مکاتبات فکر کے معترضین کے دلائل کا  
مجموعہ مدلل جائزہ

از قلم  
مولانا عبد الرحمن کیلانی

ناشر

مکتبۃ السّلام  
دکن پورہ  
کلی سنہ ۱۳۸۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: روح عزاب قبر  
مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانی  
اشاعت چہارم: مارچ 2005  
تعداد: 2200  
زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمن کیلانی  
زیر اہتمام: نجیب الرحمن کیلانی فون: 7844157  
ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمن کیلانی - انجینئر حافظ شفیق الرحمن کیلانی  
مطبع: انجینئر دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور  
قیمت: 35 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام شریعت نمبر 20، وکن پورہ لاہور  
فون: 7844157-7280943

دارالسلام بیورو

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ  
ریاض • مدینہ • شامیہ • لاہور  
لندن • جوسلفی • نیو یارک



ہیڈ آفس و مرکزی شوزروم 36 - لورڈز، انجینئر ٹیٹ شاہ، لاہور

فون: 711 1023, 711 0081, 723 2400, 724 0024 فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوزروم اردو بازار، برق سٹریٹ، مغربی شریعت، اردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## پیش لفظ

ذریعہ نظر کتاب ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مرتب نہیں کی گئی، بلکہ یہ میرے ان پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو پچھلے تین سالوں میں ماہنامہ ترجمان الحدیث اور ماہنامہ محدث میں بالاقساط شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین کا اصل موضوع وہی تھا جو کتاب کے نام سے واضح ہے۔ اس موضوع کی اہمیت جتنی کچھ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ مسلمانوں کا کوئی فرقہ یا کوئی طبقہ نہ ہوگا جو اس موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ ان مسائل میں کچھ لوگ اگر اغراط کی راہ پر چل نکلے اور انتہا کو جا پہنچے تو کچھ دوسرے تفریط کی طرف مائل مجھے اور دوسری انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ ان حالات میں یہ مضامین ہر طبقہ میں خاصی دلچسپی سے پڑھے گئے اور اب اسی مقبولیت اور افادیت کے پیش نظر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مختلف اوقات میں چھپنے والے ان مضامین کو یک جا کرنے سے کتاب ہذا میں بعض مقامات پر تکرار واقع ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح کے تکرار کو دور کر دیا جائے۔ مگر اس معاملہ میں مجھے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ایک مقام پر کسی بات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے تو دوسرے مقام پر ذرا تفصیل سے پھر مضمون کی مناسبت بھی اس بات کی متقاضی تھی۔ لہذا اجمال اور تفصیل دونوں اپنے اپنے مقام

پر درست اور ضروری معلوم ہوئے۔ لہذا اسے جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔  
پھر اس تکرار کا بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ بعض ضروری باتیں تکرار کی وجہ سے  
ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔

اس سلسلہ کی ابتداء یوں ہوئی، جن دنوں وحدت الوجود، وحدت الشہود وغیرہ سے  
متعلق میرے مضامین ”ترجمان الحدیث“ میں چھپ رہے تھے اعلان میں ضمنا رُوح  
اور بندوں کے مسئلہ تنازع کا ذکر بھی آگیا، تو ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب  
نے رُوح اور تنازع سے متعلق چند سوالات لکھ بھیجے جن کا جواب میں نے ذرا تفصیل  
سے لکھا اور یہ جواب ”الاستفتاء“ کے عنوان کے تحت ”ترجمان الحدیث“ کی اشاعت  
ستمبر ۱۹۸۲ء میں چھپا۔ اب اس استفتاء پر مزید دو حضرات (جناب عبدالقادر صاحب  
سومرد، کراچی اور محمد احسان الحق صاحب، یاروخیل۔ میانوالی) کی طرف سے سوالنامے  
آئے جن میں ان کے تفصیلی جواب کے متعلق لکھا گیا تھا۔

ان سوالات کے جواب میں میں نے ایک طویل مقالہ لکھا، جو کافی عرصہ بعد  
ماہنامہ ”محدث“ کی دو سطحوں دسمبر ۱۹۸۲ء اور جنوری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ خیال  
یہ تھا کہ یہ طویل مقالہ لکھنے کے بعد شاید مزید استفسارات کی ضرورت باقی نہ رہے گی  
وجہ یہ تھی کہ ان سوالناموں میں میرے نزدیک سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جب  
قرآن میں صرحت دوبار کی موت اور دوبار کی زندگی ہی کا ذکر ہے تو اس عرصہ موت  
میں برزخ کی زندگی کہاں سے آگئی جو اس قدر مشہور ہے؟ اور اس سوال کا جواب  
کافی تفصیل سے لکھ دیا گیا تھا۔ اسی ضمن میں عذاب قبر اور سابع موتی کے مسائل بھی  
زیر بحث آئے۔

اس مقالہ کے رد عمل کے طور پر تین طرح سے اظہار خیال کیا گیا۔ ایک

طبقہ نے کہا کہ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کو خواہ مخواہ صوفیاء کے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے  
اور نیز یہ کہ کتاب الروح امام ابن قیم کی اپنی تصنیف ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی  
دوسرے نے تصنیف کر کے اسے امام ابن قیم سے چسپاں کر دیا ہے۔ دوسرا  
طبقہ وہ ہے جو اس مقالہ کی روش اعتدال پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے تقاضا کیا  
کہ اس مقالہ کو مینفلٹ کی صورت میں الگ چھاپ کر شائع کرنا اور عوام میں

مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ جبکہ تیسرے طبقہ اس قدر تشدد ہے کہ وہ سماع موٹی کے سلسلہ میں کسی بھی استثنائی صورت کو برداشت نہیں کرتا۔ اور میں نے اس استثنائی صورت کے سلسلہ میں جو چند احادیث صحیحہ پیش کی تھیں، ان میں سے کسی روایت کو تو مجرد یا موضوع ثابت کیا اور جن روایات میں ایسی گنجائش نظر نہ آئی ان کی تادیل کر کے قرآن کریم کے اس واضح ارشاد ”کہ مڑھے سن نہیں سکتے“ کے مطابق دھال لیا اور استثنائی صورت کو ختم کر دیا۔ اور اس مطابقت کی صورت یہ پیش کی کہ قبر سے مراد یہ زمینی یا مادی یا حتیٰ قبر یا زمینی گڑھا ہے ہی نہیں۔ بلکہ قبر کے حقیقی معنی وہ برزخی قبر ہے جو برزخی زندگی یا مرحلہ میں روحوں کا مستقر ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط بھی موصول ہوئے ان میں سے نبی شہنا مختصر خط جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب (ص ب ۲۵۵۸- مدینہ منورہ) کا ہے، انہوں نے چند حوالوں کے ساتھ میری توجہ اس طرف دلائی ہے کہ میں نے علامہ وحید الزمان کی تصنیف ”لغات الحدیث“ کے حوالہ سے جو حدیث ”حَدَّثَنَا شَطْرٌ وَبَيْنَهُمْ هِنُ الْحُمَيْرَاءُ“ درج کی تھی۔ وہ موضوع ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ وضاحت فرمائی۔ تاہم یہ حدیث صرف تائید کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ لہذا اس حدیث کے موضوع قرار پانے کے بعد بھی موقف میں فرق نہیں پڑتا۔ علامہ کو کے حوالہ سے ایک ہی حدیث درج کی تھی وہ بھی موضوع نکلی۔ لہذا اسے کتاب ہذا سے خارج کر دیا گیا ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل تھے۔ اور یہ اس تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سماع موٹی کے بارے میں کسی طرح بھی استثناء کے قائل نہیں۔ اس کے بجائے وہ برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم جیسے نظریات کے قائل ہیں۔ ان نظریات کے موجد۔ جہاں تک میرے ناقص علم میں ہے۔ ڈاکٹر کسبٹن مسعود عثمانی صاحب (توحید روڈ۔ کیماری کراچی) ہیں۔ میں نے اپنے تیسرے مضمون بعنوان ”برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف“ میں ان دونوں حضرات کے اختلافات، اعتراضات اور اشکالات کے حتیٰ المقدور تفصیل سے جوابات لکھے۔

چوتھا مضمون لکھنے کی وجہ یہ بنی کہ ڈاکٹر عثمانی صاحب موصوف کے ایک متشدد دیر و کار۔ جناب اشفاق صاحب (ناظم آباد کراچی) نے مجھے نہایت تند و تیز لہجہ میں ایک طویل خط لکھا اور مجھے سخت سکت کمنے کے ساتھ ساتھ آخر میں یہ التماس کی گئی تھی کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کا نظر غائر لٹریچر پر رکھ کر اپنے نظریات پر نظر ثانی کروں۔ لہذا اب میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ڈاکٹر عثمانی صاحب کے نظریات اور دلائل کا تجزیہ پیش کروں۔ چنانچہ چوتھا مضمون "ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ" اسی نہیں منظر میں سپرد قلم ہوا اور ساتھ ہی اشفاق صاحب کا خط بھی بعینہ شائع کر دیا گیا۔ یہ خط اور اس کا جواب دو اقساط میں شائع ہوئے۔

ان حضرات کی خط و کتابت سے فراغت ہوئی تو جناب چوہدری محمد علی صاحب خفگی کا ایک طویل ترین خط بصورت مضمون موصول ہوا۔ تحریر کا انداز اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ یہ مضمون چودھری صاحب کے بجائے کسی متاثر عالم دین کا ہی ہو سکتا ہے جنہوں نے چودھری صاحب کی آڑ لے کر اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ تمام تر مضمون نفی سیاہی سے اور رولوں و اٹل شکستہ خط میں تحریر تھا جبکہ نیچے چودھری صاحب کے دستخط اور پتہ کالی سیاہی سے، نسبتاً باریک قلم سے اور ناچختہ خط شکستہ میں ثبت تھے۔ جو کچھ بھی تھا، مجھے تو بہر حال جواب دینے سے غرض ہے۔ چودھری صاحب موصوف صرف سماع موٹی پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ اس کے جواز کو بنیاد بنا کر اس سے بعد از مرگ اولیاء اللہ کی کرامات اور تصرف فی الامر پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اس خط یا مضمون میں سماع موٹی کے علی الاطلاق جواز کو قرآن، حدیث، اقوال صحابہ اور بزرگوں کے اقوال سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخر میں یہ استدعا بھی کی گئی ہے کہ میرے اس خط یا مضمون "سماع موٹی" تصویر کا دوسرا رخ" کو وسعت قلبی سے کام لیتے ہوئے بحسنہ محدث میں شائع کر دیا جائے اور اس مسئلہ کا فیصلہ قارئین کرام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

اگرچہ یہ خط یا مضمون بہت طویل تھا، تاہم چودھری صاحب کی خواہش کا

احترام کرتے ہوئے یہ خط پورے کا پورا شائع کر دیا گیا اور میرا جواب اس صورت میں ہے۔ کہ مہر صفحہ میں لائن کے اوپر تو چودھری صاحب کا مضمون مسلسل چل رہا ہے اور لائن کے نیچے حواشی کی طرز پر میرے جوابات مسلسل چلتے ہیں۔ اگر کسی صفحہ پر لائن نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب مواد چودھری صاحب کا ہے۔ یہ صورت محض اختصار کی خاطر اختیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون بعد جوابات محدث کی تین اقساط میں شائع ہوا تھا۔ کتاب نما میں اس پانچویں مضمون کا عنوان "سراج موتی سے تصرفات اولیاء اللہ تک" تجویز کیا گیا ہے۔

ان مضامین کے بالاقساط اور مختلف ادوار میں چھپنے سے یہ فائدہ ضرور ہو گیا ہے کہ میرے بیان سے اختلاف رکھنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو اختلاف و اعتراض کر کے ٹکا اچھا موقع مل گیا اور اسی طرح مجھے ان حضرات کو جواب دینے کا۔ اس طرح اس موضوع کے تمام تر پہلو سامنے آ گئے، جو ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی صورت میں شاید نہ آ سکتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی تاویلات کے بھندے سے بچائے اور شریعت کا سیدھا سادا اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالرحمن کیدانی۔ دارالسلام۔ و سن پور۔ لاہور  
شوال ۱۴۰۵ھ مطابق جولائی ۱۹۸۵ء



# فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۹	دوسرا مرحلہ دنیوی زندگی	۳	پیش لفظ
۳۰	استثنائی صورتیں	۸	فہرست مضامین
۳۱	۱۔ احیائے موتی	۱۲	① الاستقام
۳۱	ب۔ خواب	۱۳	الجواب
۳۲	برزخ کا لغوی مفہوم	۱۴	۱۔ امر ربی کا مفہوم
۳۲	برزخی موت یا نیند	۱۴	۲۔ سوال روح کے سائل؟
۳۳	روح انسانی یا ناقص	۱۶	۳۔ روح کی قسمیں
۳۳	روح سے متعلق چند حقائق	۱۶	۴۔ تناسخ یا آواگون
۳۵	تیسرا مرحلہ عرفۃ برزخ	۱۸	روح کا سفر
۳۵	استثنائی صورتیں	۱۸	شہداء کی زندگی
۳۵	۱۔ عذاب قبر	۱۹	سماع موتی
۳۵	عذاب قبر کی حقیقت	۱۹	۵۔ تناسخ اور روح کلی
۳۶	قرآن اور عذاب قبر	۲۱	۶۔ حالت نزع میں رنج و رقت
۳۸	قبر اور حدیث	۲۱	۷۔ بدرود صی
۳۹	عذاب قبر کا عقلی ثبوت	۲۳	② روح، عذاب قبر اور
۳۹	عذاب قبر روح اور بدن	۲۳	سماع موتی
۴۰	آزمائش اور حساب کا نرق	۲۶	الجواب
۴۲	ب۔ سماع موتی	۲۶	زندگی اور موت کے چار مراحل
۴۳	استثنائی صورت	۲۷	پہلا مرحلہ موت ہے۔
		۲۷	روحوں کی پیدائش کب ہوتی؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۵۸	علامہ وحید الزمانؒ	۴۳	استثنائی صورتوں کے نتائج
۵۹	سماعِ موثق اور مولانا مودودیؒ	۴۴	سماعِ موثق کے قائلین کا {
۶۰	سماعِ موثق کی پشت پناہی		طرز استدلال
۶۲	چوتھا مرحلہ - آخری زندگی	۴۵	۱۔ قرآنی آیات کی تاویل
۶۲	ارواح کی بین المراحل		تاویلات کا جائزہ
۶۲	پیش رفت اور رجعت {	۴۶	۲۔ احادیث صحیحہ
۶۳	شہداء کی زندگی		۳۔ تفسیر سے اور چوتھے درجہ کی احادیث
۶۳	روحوں کی واپسی		۴۔ بزرگوں کے اقوال
	نگاہِ بازگشت		متکرمین سماعِ موثق کے دلائل
	۳۔ بزرخی قبر اور بزرخی		۱۔ قرآن
۶۴	جسم سے تعارف {	۴۷	۲۔ احادیث صحیحہ
	مراسلات (۱)		۱۔ مقتولین بدر
۶۸	مفسر کے دلائل کا جائزہ	۴۹	حضرت عائشہؓ کا تفقہ
	۱۔ قبر کا اصل مقام	۵۰	۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا
۶۹	۲۔ عذابِ قبر کا حجم سے تعلق		۳۔ جو قوت کی چاپ سنا
۷۰	پہلی حدیث	۵۱	۴۔ حضور اکرمؐ پر صلوة و سلام
۷۱	دوسری حدیث	۵۲	سلام تشہد
۷۲	تیسری حدیث	۵۳	موضوع احادیث
	مفسر کے دلائل کا جواب		نقد و نظر
۷۶	مفسر کے اشکالات	۵۴	موضوع حدیث ۲
	۱۔ قبر کا معنی اور مقام	۵۵	علمائے دین اور سماعِ موثق
۷۷	۲۔ نقد احادیث	۵۶	جعلی حدیث کے نتائج
۷۹	۳۔ تاویل احادیث	۵۷	کتاب الروح اور سماعِ موثق
۸۱	ماحصل		لام ابوظیفہؒ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۰۸	سماع موتی کے متعلق قول فیصل	۸۳	۴) ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ برائے استاد
۱۰۹	نظریہ برزخی قبر کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت	۸۴	اشفاق صاحب کا عتاب نامہ
۱۱۰	۵) سماع موتی سے تصرفات اولیاء تک	۹۰	جوابات
۱۱۱	مراسلات (۳)	۹۱	۱۔ مقام قبر؟
۱۱۲	سماع موتی تصویر کا دوسرا رخ	۹۲	برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے
۱۱۳	کیا سماع موتی کے قائل مشرک ہیں؟	۹۳	برزخی جسم
۱۱۴	بزرگوں کی مشترک اور متواتر کوششیں	۹۴	کیا غیبین اور سچین برزخی
۱۱۵	پھیلوں کا پہلو پر لعن طعن ائمہ مشائخ کے اقوال کو حجت	۹۵	مقام ہیں؟
۱۱۶	سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔	۹۶	قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے
۱۱۷	فرقہ پرستی کی اصل بنیاد برطی جماعت یا سودا عظیم	۹۷	شاخوں والی حدیث کا نیا مطلب؟
۱۱۸	کا مفہوم	۹۸	برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط
۱۱۹	سماع موتی پر اجماع اُمت؟	۹۹	قبر کے عام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات
۱۲۰	شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور پیران پیر کی نماز اموات کا احساس و شعور	۱۰۰	اعتراضات کے جوابات
		۱۰۱	شہداء اور عالم برزخ
		۱۰۲	۲۔ اعادہ روح اور عذاب قبر
		۱۰۳	قد عَزَّ وَجَلَّ لَہُو کی عثمانی تشریح
		۱۰۴	اعتراض ۱۔
		۱۰۵	جواب
		۱۰۶	اعتراض ۲۔
		۱۰۷	جواب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۲۲	نص میں اجتناب دہیں۔	۱۲۱	قرآن سے سماع موثق کے دلائل
۱۲۳	انکار سماع موثق سے {	۱۲۲	دلیل کا جواب
۱۲۳	حضرت عائشہؓ کا رجوع؟	۱۲۳	واقعی حدیث اور سماع موثق
۱۲۴	باب سماع میں حضرت عائشہؓ	۱۲۴	دوسری واقعی حدیث
۱۲۴	سے مروی روایات۔	۱۲۵	تیسری واقعی حدیث
۱۲۴	ابن ابی الدنیا کی روایات	۱۲۶	بزرگوں سے بغض و عناد؟
۱۲۵	حضرت عائشہؓ کا اپنے	۱۲۸	میں دونوں اللہ کی تفسیر
۱۲۶	بھائی سے خطاب۔	۱۳۰	معبودانِ باطل اور {
۱۲۶	ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟	۱۳۰	بزرگ ہستیاں
۱۲۷	فوت شدہ بزرگوں سے {	۱۳۳	والنارعات غرقا کی تفسیر
۱۲۷	عورتوں کا پردہ؟	۱۳۵	ترجمہ میں "نفوس فاضلہ" {
۱۲۷	حیاتِ برزخ اور سماع موثق {	۱۳۵	کے اضافہ کے فوائد
۱۲۸	کیا لازم و غرض ہیں؟	۱۳۶	احادیث رسول اللہ سے {
۱۲۸	سماع موثق یا {	۱۳۶	سماع موثق کا ثبوت
۱۲۸	احترام آدمیت؟	۱۳۸	سماع موثق اور صحابہ کرامؓ
۱۲۹	امام ابو حنیفہؒ سے منسوب روایات	۱۳۹	حدیث صحیح، استنباط غلط
۱۵۰	متکبرین سماع موثق کے امام اعظم	۱۴۰	حضرت عائشہؓ کے انکار {
۱۵۱	معمد کس کے لیے؟	۱۴۰	سماع موثق پر ایک نظر



# الاستفتاء

(یہ استفتاء ترجمان الحدیث ستمبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔)

غلامِ رسول زائد قبولہ ضلع ساہیوال سے لکھتے ہیں:  
 مکرمی جناب کیلانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔  
 تعریفِ خدا اور توصیفِ خاتمِ المرسلین۔

اما بعد: بندہ گورنمنٹ کالج لاہور میں سال دوم کا طالب علم ہے۔ پانچ ماہ ترجمان الحدیث میں آپ کے مضامین پڑھنے کے بعد دلی طور پر آپ کے قلمی جہاد اور آپ کی علمی استعداد کا معترف ہو گیا ہوں۔ خدا آپ کو ملتِ اسلامیہ کی بھرپور خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!  
 گزشتہ شماروں میں موجودہ شماروں تک حالاً آپ کا بصیرت افروز سلسلہ وار مضمون "نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود" شائع ہو رہا ہے جس سے آپ کی علمی لیاقت اور گہر مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

اس سلسلے میں چند سوالات ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے مخصوص انداز سے ان کا حل بیان فرمائیں گے۔ میں اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں گا۔  
 مزید یہ کہ علم میں اضافہ کا موجب ہو گا۔ براہِ راست جواب کے لیے ممنون ہوں گا۔  
 (۱) قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "روحِ خدا کے حکم سے" ہے کیا "روحِ خدا کا حکم ہے" اور "روحِ خدا کے حکم سے ہے" میں تین فرق نہیں؟

(یہ سوال میں اس لیے کر رہا ہوں کہ بعض کتب میں "روحِ خدا کا حکم ہے" درج ہے۔  
 جیسے کیا ہے سعادت از امام غزالی) اگر ان میں فرق ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں تو کیسے؟

(۲) چونکہ استفسار کرنے والے یہودی تھے۔ اس لیے اگر ہم اس خطاب کو انہی کی طرف تصور کریں کہ تمہیں اس کے بارے میں بہت کم علم دیا گیا ہے۔ تو مسلمانوں کی بابت کیا سمجھا جائے؟

(۳) علماء روح کو دو درجوں میں تقسیم کرتے ہیں: جیسے کہ امام غزالیؒ نے انھیں روح حیوانی اور روح انسانی کا نام دیا ہے اور علیؒ جو بری نے نفس زریں اور نفس بالاکا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آئینہ مبارک میں کونسی روح کی طرف اشارہ ہے اور کیوں؟

(۴) کیا ہندوؤں کا نظریہ آواگون اور مشہور شیعہ فرقہ طیارہ کا نظریہ روح باہمی مطابقت سے مستثنیٰ ہیں؟

(۵) مسلمان فلاسفہ جیسے ابن رشد نے بھی روح گلی کا نظریہ پیش کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ بروح جسم سے جدا ہونے کے بعد روح گلی میں چلی جاتی ہے۔ کیا اس نظریہ اور ہندوؤں کے نظریہ تنازع کا مرکز حتمہ ایک ہی نہیں؟

(۶) غنیۃ الطالبین میں حدیث مذکور ہے کہ آپؐ فرمایا کہ "نیک روح بدن سے یوں باسانی نکلتی ہے جیسے برتن سے پانی نکلتا ہے جبکہ بُری روح بدن میں پھیل جاتی ہے اور اس شدت سے کھینچی جاتی ہے کہ تمام جسم درد سے بلبلاتا نکلتا ہے۔ (در باب آخرت) یہ مفہوم حدیث ہے الفاظ نہیں۔ کیا آپ اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں؟

(۷) روح اور بدروح میں فرق واضح کریں؟ شکریہ!

## الجواب

۱۔ امر ربی کا مفہوم۔

"روح خدا کے حکم سے ہے؛ یا "روح خدا کا حکم ہے" میں الفاظ کا فرق تو ضرور ہے مگر نتیجہ مفہوم دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ  
حکم بھی اسی کا چلے گا۔ (۴۴)

اس آیت میں الْخَلْق سے مراد تمام مخلوق اور الْأَمْر سے مراد تمام قسم کے احکام ہیں

ان تمام احکام میں سے ایک حکم رُوح بھی ہے۔ اب اگر اَلَا تَرٰ کَواکِبَ اَکَافِی تَصَوُّرِ کَیَا حَیْے  
تو رُوح اس کا مجزہ ہوا جیسے کہ ارشاد باری ہے :-

قُلِ الْوُحُوشُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۶)

رُوح اللہ کے حکم سے ہے۔

اور اگر اَلَا تَرٰ سے مراد تمام احکام لیے جائیں تو رُوح بھی ایک مستقل حکم ہے۔ لہذا اگر  
کوئی صاحبِ مے رُوح خدا کا حکم ہے سے تعبیر کریں تو ہمارے خیال میں مفہوم میں کچھ فرق نہیں پڑیگا۔  
۲۔ رُوح سے متعلق سوال کرنے والے؟

استفسار کرنے والے یہودی یا مشرکین کہتے تھے۔ جنہوں نے یہودیوں ہی کے کہنے پر حضور کریم  
سے چند سوالات پوچھے۔ انہی میں سے ایک سوال رُوح کے متعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح سے متعلق  
سوال کے جواب میں جو یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ ”تھیں رُوح کے متعلق بہت کم علم دیا گیا ہے“  
تو یہ خطاب نہ یہود سے مختص ہے نہ مشرکین کے سے۔ بلکہ اُس کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں۔ غرض  
وہ علم ہوں یا کافر، عالم ہوں یا جاہل، نبی ہوں یا ولی، کیونکہ انسان میں متنی علمی استعداد و ولایت کی گمنی  
ہے۔ وہ رُوح کی گنجینہ سے تامل و عاجز ہے۔

### ۳۔ رُوح کی قسمیں۔

رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رُوح حیوانی جس کا تعلق گردشِ خون سے ہے۔ جب تک گردشِ  
خون برقرار ہے یہ رُوح بھی موجود ہوگی۔ گردشِ رک جائے تو رُوح ختم ہو جاتی یا نکل جاتی ہے۔ بالفاظِ  
دیگر جب تک یہ رُوح موجود ہو گردشِ خون برقرار رہتی ہے۔ اگر یہ رُوح نکل جائے تو گردشِ خون ختم ہو جاتی  
ہے۔

دوسری قسم رُوحِ نفسانی ہے جسے رُوحِ انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو انسان  
خواب میں کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان  
کے حواسِ خمسہ کی کارکردگی میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باہرہ و لامرہ اور  
ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس اگر غفلتِ نیازہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوتے ہوئے آدمی  
کو آواز سے کہ جگائے تو یہ رُوحِ نفسانی دوبارہ جسم میں کوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا  
بدبو بھی بسا اوقات انسان کے جاگنے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں قسم کی رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا  
ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو مجزے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے تعلق  
اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، بشارتِ بشارتِ نظر آتا ہے۔ اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب

میں کرنی ناگوار عادت پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی چپے پتلے لگتا ہے اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے۔ اور اگر خواب میں کہیں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بھی بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاننے کے بعد خود شاد ہو کر سکتا ہے۔

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے باہمی تعلق کے بارے میں یہ بات بھی غور و خفا کرنا چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح کے خاتمہ سے دوسری رُوح خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال تیل بجھنے کو ایک شخص سو یا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کسی دوسرے شخص نے اسے سوتے میں قتل کر دیا تو کب نفسانی خواہ کہیں بھی سیر کرتی ہوگی۔ یہ اب دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر دوسری رُوح خواب اگر دوسری نفسانی رُوح اللہ تعالیٰ قبض کر لیں تو رُوح حیوانی کی کارگزاری یعنی دوسری رُوح خود بخود ختم ہو جائے گی اور انسان پر موت واقع ہو جائے گی۔ ارشاد باری ہے:

”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا  
وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا لِنَبِّئُكَ  
الَّتِي قَطَعْنَا بَيْنَهَا سَلَكًا ۖ فَيَزُولُ  
إِلَىٰ خَلْقٍ آخَرَ أَفَلَا يَرَوْنَ قَسَمًا ۚ  
(الزمر: ۳۲)

”اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت ان کی رُوحیں  
قبض کر لیتا ہے اور جو مرنے نہیں اُن  
کی رُوحیں سوتے ہیں (قبض کر لیتا ہے)  
پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے ان کو  
روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو ایک  
مقررہ وقت کے لیے چھوڑ دیتا ہے؟“

آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

- ۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو ہر دم انسان کے بدن میں موجود رہتی ہے اور دوسری وہ جو خواب میں جسم کے بیخود ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ جاگتے میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں یا رُوح کے ہر دو جہان انسان میں موجود رہتے ہیں۔
- ۳۔ رُوح کو قبض کرنا یا موت دینا صرف اللہ تعالیٰ کے بس میں ہے۔ اگر وہ خواب کے دوران رُوح نفسانی کو قبض کرے تو بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔
- ۴۔ بیداری کی حالت پر پوری زندگی اور خواب کی حالت نیم زندگی کی کیفیت ہے جس میں کچھ صفات زندگی کی پائی جاتی ہیں اور کچھ موت کی۔ مگر باریہ کیفیت موت و حیات کے درمیان بزرگی حیات کی مظہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دنیا اور آخرت کی زندگی کے درمیان قبر کی زندگی بزرگی زندگی ہوتی



ہے۔ فرق صرف یہ ہے، قبر کی زندگی میں موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ اور خواب کی زندگی میں زندگی کے۔ خواب کے دوران چونکہ کچھ خصوصیات موت کی بھی پائی جاتی ہیں اس لیے حضور اکرمؐ نے اسے موت سے تشبیہ دی ہے۔

## ۴۔ تناسخ یا آواگون۔

تناسخ یا آواگون کا نظریہ خالص ہندو مذہب ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض متعصبین یا مسلمانوں کے بعض فرقے جو اس عقیدہ کو درست سمجھتے ہیں۔ اور قرآنی آیات سے نئے نئے کسے کی کرشمہ کرتے ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ باطنیت اور روحانیت نے جن اسلامی عقائد و نظریات پر غبار کر کے ان کا علیہ بگاڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

امادیت صحیحہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جسے امام بخاریؒ بھی قرآن کی آیت:  
 "وَلَا تَحْزَنْ فِي يَوْمٍ يَتَّبِعُونَ"  
 "اور اے اللہ مجھے قیامت کے دن  
 رسوا نہ کرنا۔" (۲۹/۸۷)

کے تحت کتاب التفسیر میں لائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ کو رسوا کیا جائے گا۔ تو حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ "یا اللہ! تیرا وعدہ ہے، تو قیامت کے دن مجھے رسوا نہ کرے گا۔ اور میری اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرا باپ اس طرح رسوا ہو رہا ہے؟" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھئے! اتنی دیر میں آپ کے باپ (آؤ یا تناسخ) کی شکل تبدیل کر دی جائے گی۔ آپ دیکھیں گے تو آپ کو خواہست میں بیٹھ رہا ہوگا ایک بچہ نظر آئے گا۔ جسے فرشتے دوزخ میں ڈال دیں گے۔ تاکہ کوئی شخص یہ معلوم نہ کر سکے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ ہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو رسوائی سے بچایا جائے گا۔ اور ان کے باپ کو بھی اس کے گناہوں کی قرار واقعی سزا مل جائے گی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پس منظر میں پڑتی ہے:-

- ۱۔ قیامت کے روز ارواح کو جو جسام عطا کیے جائیں گے وہ وہی مانوس انسانی بدن ہوں گے، جنہیں دوسرے رنگ پہچانتے ہوں گے۔
- ۲۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو بخراجم دیاجا تو بعض ایک اشتنائی صورت ہے جس کے لیے ایک ٹھوس بنیاد ہے۔

۳۔ اللہ کا قانون جتنا دھڑا سنا مستحکم اور ہمہ گیر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ غلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے باپ کو بھی عذاب الہی سے بچا نہیں سکیں گے تو کسی دوسرے پر تقیر یا نبی دلی کی کیا مجال ہے کہ وہ قیامت کے روز کسی کی نجات کا دم بھرے۔

اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا ایک پرنظر پیش کیا ہے :  
 قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝  
 أَن مِّنْ مِّنْ سَائِرِ الْوَحْيِ ۝  
 قَوْلُكَ لِيَنَّ الْمَصْدِقَ ۝  
 إِذَا

مِنَّا رَكْنًا مُّرْتَبَا وَحِطَّ مَاءُ ۝  
 لَمَّا يَأْتُونَ ۝  
 فَالْظَّلْمَ كَدًّا فِي سَوَاءٍ ۝  
 (الصَّفَّت : ۵۱ - ۵۵)

کہ بھلا تم بھی (ایسی باتیں) باد کو نہ والوں  
 میں سے ہو، بھلا جب ہم مر گئے اور  
 مٹی اور لہریاں ہو گئے تو کیا ہم پر گزرت  
 ہو سکے گی؛ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کیا  
 تم اس سے باخبر ہونا چاہتے ہو، پھر جب  
 جہان کے گاتواس (برے ساتھی) کو دروغ کے وسط میں دیکھے گا ؟

ان آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک بھٹ انسان بھی اسی مانوس شکل کو منظور رہا ہوگا۔  
 جو اس نے دنیا میں دیکھی تھی جو باقی قیامت کے دن وہی بدن اور وہی شکلیں ارواح کو دی جائیں گی  
 جو اس دنیا میں تھیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس دن ایک  
 دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ اور یہی اسی صورت میں ممکن ہے جب ارواح کو وہی اجسام اور وہی  
 شکلیں عطا کی جائیں جو دنیا میں تھیں۔

اب دیکھئے نصوص قرآنیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے دن  
 تک مومنوں کی ارواح عقیقین میں اور کافروں کی ارواح سچین میں مقید ہوتی ہیں مان کو کوئی غلام  
 عطا نہیں کیا جاتا۔ اور قیامت کے دن جو جسم عطا کیا جائے گا وہ وہی ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ تو بلا  
 کہ اب تاسخ کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ جس کی رو سے مرنے کے بعد روح کو کبھی کسی گدے  
 کا جسم عطا کیا جاتا ہے کبھی کبھی پتھر یا پتو کا اور کبھی گتے اور سوز و فیر کا۔

یہاں ضمناً ایک دو باتیں اور بھی سامنے آئیں۔ جن میں سے ایک تو شہدائے زندگی نے متعلق  
 ہے۔ جن کے متعلق قرآن میں ہے کہ انھیں مردہ مت کہو، وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اور حدیث

ہیں ہے کہ شہداء کی رُوحیں سبز پندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چھپائی پھرتی ہیں۔ اور دوسری بات سلام موتی سے تعلق رکھتی ہے۔

**روح کا سفر:**

روح کا سفر اس طرح ہے کہ انسان جب بطن مادر میں موجودگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں روح داخل کی جاتی ہے۔ پھر وہ بطن مادر سے باہر آتا ہے۔ اب یہ بچہ کہلاتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ پھر اس پر موت آتی ہے یعنی قبر کی زندگی یا برزخی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد قیامت کے دن اس طرح کے اجسام ہیلے کیے جائیں گے اور یہ بھی پوری زندگی ہوگی۔

### شہداء کی زندگی:

اب دیکھئے زندگی کے اس سفر کی منازل میں شارٹ کٹ تو ہو سکتا ہے لیکن واپسی ناممکن ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک بچہ جوان ہونے یا بوڑھا ہونے سے پہلے ہی مر جائے یا عظیم آدمی ہی مر جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے یا بچہ عظیم آدمی بن جائے۔ امام اصطلاح میں بھی موت کہا جاتا ہے اور قرآن نے بھی اسے موت ہی سے تعبیر کیا ہے۔ حذف کر دی گئی ہے۔ اور شہید مرنے کے بعد فوراً جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ ایک استثنائی صورت ہے۔ تو جس طرح یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ اسی طرح ان کے اجسام (سبز پندوں کی شکل) بھی ایک استثنائی صورت ہے۔ ورنہ قیامت کے دن انھیں پھر وہ جسم عطا کئے جائیں گے جو اس دنیا میں تھے اور لوگ انھیں پہچانیں گے۔

### سلام موتی:

اور سلام موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو وہ جس جسم بھڑکے طبعین یا سچین میں مقید ہیں۔ وہ واپس دنیا میں نہیں آ سکتیں۔ اور نہ ہی شہداء کی وہ رُوحیں دنیا میں واپس آ سکتی ہیں جو براہ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں۔ احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ جنت میں شہداء سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمھاری کوئی آرزو ہو تو بتاؤ تاکہ وہ پوری کر دی جائے۔ تو شہداء جواب دیں گے کہ ہمیں تو یہاں سب نعمتیں میسر ہیں، احد ہمیں کیا درکار ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بار بار اصرار پر شہداء یہ جواب دیں گے۔ کہ پھر ہماری آرزو یہ ہے کہ ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تاکہ ہم پھر شہید ہو کر مزید بلند درجات حاصل کر سکیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ بات میرے قانون کے خلاف ہے۔ تم دنیا میں واپس

نہیں جاسکتے۔ کوئی اور بات ہو تو بتائیے؟ پھر شہدار جواب دیں گے کہ پھر کم از کم دنیا والوں کو اور جیسے عزیز واقارب کو اس بات سے مطلع کر دیا جائے کہ ہم یہاں کس قصد خوش ہیں اور ہر طرح کے انعامات سے متمتع ہو رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ ہاں میں یہ اطلاع کیے دیتا ہوں؟ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

فَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَعْيَاؤُكُمْ ذُرِّيَّوَهُمْ  
يُرْزَقُونَ۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ  
مِنْ فَضْلِهِمُ وَلَيَسْخَرَنَّ مِنْكَ الَّذِينَ  
كُفَرُوا بِمَا لَهُمْ مِنْ حُلُوفٍ وَأَلَا  
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔  
سبحو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں  
مرے مجھے نہ کہنا بلکہ وہ تو زندہ ہیں  
اور انہیں اپنے رب کے ہاں سے رزق  
مل رہا ہے۔ جو کچھ خدا نے ان کو اپنے فضل  
سے دے سکی ہے اس میں وہ خوش ہیں۔  
اصان لوگوں کو (اس دنیا میں) ان کے  
پچھپے ہیں اور سر کران میں شامل نہیں  
ہوئے ہیں جو خیر جیتے ہیں کہ ان پر

(آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰)

نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمناک ہیں؟  
غور فرمائیے کہ جنت میں شہدار کی آسائشوں میں بھی نہ اپنے عزیز واقارب کو دنیا میں اگر کوئی پہنچا  
سکتی ہیں اور نہ ہی ان کی قبر پر پکارنے والوں کو کچھ کہہ سکتی ہیں۔ تو وہ رُوحیں جو پختہ اور عینین میں  
مقیم ہیں، وہ کیسے دنیا میں واپس آکر دنیا والوں کی بات سنتی یا ان سے ہم کلام ہو سکتی ہیں؟  
۵۔ تناسخ اور روح کلی۔

تناسخ کی طرح روح کلی کا نظریہ بھی ہندو فلسفہ سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو رہبانیت کے  
راستہ سے اسلام میں داخل ہوا۔ اور جس کا دعویٰ الہی سے کوئی تعلق نہیں۔  
ہندو فلسفہ روح کی مختلف کیفیتوں کو آتما، مہاتما اور پراتما سے تعبیر کرتا ہے۔ آتما وہ رُوح  
ہے جو عام انسانوں کے جسم میں داخل ہے۔ جب یہ رُوح مختلف جہازوں سے سفر کرتی ہوئی پاک و  
پورتر ہو جاتی ہے۔ تو کسی جہگ دربر انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور مہاتما کہلاتی ہے۔ مہاتما  
گاندھی یا مہاتما بھگوان کے ہاں ایسی ہی ہستیاں ہیں۔ پھر جب یہ رُوحیں مزید پاکیزگی حاصل کرتی ہیں  
تو پراتما (مثلاً یا پریشور) کی رُوح کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ اس بعد کیسے مسلمان صوفی بھی حاصل بحق حاصل  
باشہ اور فنا فی اللہ جیسی اصطلاحات وضع کر کے اسی ہندو فلسفہ کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہی الہی



کَمَا تَرَوْنَ هَٰذَا النُّعْمَةَ لَا تُغْنَاكُمْ  
فِي مَالِكِهِمْ ۚ  
رات کے چاند کو دیکھا تو فرمایا تم مسرور  
اور نہ کے بعد آخرت میں اپنے رب سے  
طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھتے  
اور تمہیں کوئی اور جن محسوس نہ ہوگی

(بخاری کتاب التوحید)

پھر اس کے بعد اپنے یہ آیت پڑھی:  
وَجِئُوا يَوْمَئِذٍ بِآخِصَةٍ اِنِّي رَکَّحْتُ الْخَلْقَ  
اس دن بہت سے جہرے پڑھتی ہوگی  
اور اپنے پروردگار کے عجز و عجز ہوں گے

(۲۱-۲۲)

اب دیکھیے اگر روح کے تدویر کلی میں اتصال کا نظریہ صحیح ہو تو یہ دیدار الہی، یہ خدا سے ہم کلامی  
اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے حساب کتاب لینا، آخر یہ باتیں کس کھاتے میں جھکا  
گی؟ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ روح کلی میں اتصال کا نظریہ گین و حیان کا نظریہ تو ہو سکتا  
ہے۔ وہی الہی کلی ہر پاس سے اہل کفایت ہے۔

## ۶۔ حالت نزع کی رنج و راحت۔

حرم حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث موجود و مرید ہے جس کا غلبہ مرگ یہ ہے کہ جس  
انسان کی تدویر دنیا اور اس کے تعلقات کی محبت میں جس قدر زیادہ پھنسی ہوئی ہوگی، حالت نزع میں  
اس کی جان یا روح اتنی ہی مشکل سے نکلے گی۔ اور جس شخص کی روح دنیا اور اس کے تعلقات میں نہ رہے  
اس سے بے نیاز رہی ہے وہ روح آسانی سے نکلے گی۔ اس بات کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ  
تکلیف نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک پہلو سے تعلق ہے۔ اس میں بھی مستثنیات موجود ہیں۔ خود حضور کریم  
نے حالت نزع میں کافی تکلیف اٹھائی۔ حالانکہ آپ مذہب کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ حالت نزع  
میں آپ نے جو تکلیف دیکھی اسے دیکھ کر حضرت عائشہ صدیقہ نے اس نظریہ کو مشکوک قرار دیا تھا۔  
اس تکلیف کی وجہ خواہ زہر کے اثرات کا مرنے الموت میں دوبارہ عود کرنا ہو یا کوئی دوسری وجہ ہو۔  
بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے مرنے الموت میں کافی تکلیف اٹھائی تھی۔

## ۷۔ یدِ رُوحیں۔

بدارواح سے مراد وہ رُوحیں ہیں جو ولی الہی کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتیں۔ خواہ یہ رُوحیں  
انسانوں سے تعلق رکھتی ہوں جو زمین میں مقید ہیں یا ابھی اسی دنیا میں ہیں۔ یا شیطان رُوحیں یا جنوں  
کی رُوحیں جو اسی دنیا میں موجود ہیں۔ انسانوں کو گمراہ بھی کرتی ہیں اور تکلیف بھی پہنچاتی ہیں قرآن

میں ہے! وَكَذَٰلِكَ جَاءَ الْوَيْلَ لِلْإِنسَانِ بِمَا كَفَرَ  
 اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض خفایا کی پناہ  
 پکڑا کرتے تھے۔ اُس سے اُن کی سرکشی اور  
 (البقرہ: ۶)

اور حضرت رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو بیت الخلا میں جانے سے پیشتر یہ دُعا سکھلائی ہے:  
 اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبۡثِ  
 اے اللہ میں بد مذہبوں سے خواہ وہ کفر  
 ہوں یا مادہ، تیری پناہ میں آتا ہوں؟

بد مذہبوں سے بچنے کا یہی طریقہ مسنون ہے۔ ہماری ہاں جو لوگ مختلف قسم کے چٹے اور دھنیں  
 کر کے بخشش نفل اور ہفت میل وغیرہ وضع کر کے ایسی مذہبوں سے اپنی مرضی کے کام لیتے۔ گوہوں کو مندر  
 پہنچاتے یا اُن کے مندر سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ سب مشرکانہ افعال ہیں۔ ایسی روجوں کے  
 مندر سے بچنے کے لیے متوہمین کا ورد، سورۃ جن کی تلاوت، زخیرہ کی دُعا یا بیت الخلا سے جانے  
 سے پہلے کی دُعا وغیرہ جو باتیں مسنون ہیں وہ تو عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ لیکن جن اعمال و فاعلات اور  
 کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اُن کے استعمال سے بہر حال پرہیز ضروری ہے۔  
 لٰہٰذَا مَا جِئْنَا بِیْ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالْقٰصِدِ!



## روح، عذاب قبر اور سماع موتی

(یہ مقالہ محدث صفر، ربیع الاول اور ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوا۔)

کچھ عرصہ قبل راقم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں مروج سے متعلق چند امور زیر بحث آئے تھے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے مجھے دو حضرات کی طرف سے یہ سوال نامے موصول ہوئے ہیں۔ پہلے سائل جناب عبدالقادر صاحب سومرو کراچی سے لکھتے ہیں کہ:

”مکرمی جناب کیلانی صاحب،

آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا ہے کہ:

”ادماع موتی اس لیے ناممکن ہے کہ جو رومیں جسم چھوڑ کر علیین یا تنجیم میں مقید ہیں وہ واپس دنیا میں نہیں آسکتیں۔ اور وہی شہداء کی وہ رومیں دنیا میں واپس آسکتی ہیں جو براہ راست جنت میں پہنچ چکی ہیں؟

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ سماع موتی ناممکن ہے۔

۲۔ مرنے کے بعد ادماع کا دوبارہ جسموں میں آنا ناممکن ہے۔

اور چونکہ قرآن و احادیث، صحیح اس پر گواہ ہیں کہ مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس جسم میں روح نہیں آسکتی۔ لیکن دوسری طرف مولانا سیف الرحمن افکار نے اپنے ایک مضمون میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

”ہجرت کرنے والے مومن عورت کی دھار سے اللہ نے اس کے بیٹے کو دوبارہ زندہ

کیا۔“

پھر جب ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب ”اتقن العراط المستقیم“ اور ”کتاب الوسیلہ“ کا مطالعہ کیا تو عقل حیران رہ گئی کہ صرف یہی نہیں کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو گیا، بلکہ اس نے مادہ کی



ساتھ کھا بھی کھایا۔ اس کے بعد جب غم سے دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا تو ذہن بڑی الجھن کا شکار ہو گیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ان نظریات اور عقائد کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ لیکن ان کتابوں میں تو انہوں نے ان تمام باتوں کو مان کر سند سے دی جو آج کفر و شرک کی بنیاد ہیں۔

شیخ الاسلام دونوں کتابوں "اقتناء العلوٰۃ المستقیمہ" اور "کتاب الوسیلہ" میں لکھتے ہیں:

۱۔ "جب کوئی شخص کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے، جسے وہ دنیا میں جانتا تھا اور اس پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح اس میں ٹوٹا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے؟

(کتاب الوسیلہ ص ۳۲، اردو ترجمہ اسلامی کلامی لائبریری، اقتناء العلوٰۃ المستقیمہ، اردو ترجمہ مجلس نشر اسلامی، ص ۱۰۰)

۲۔ اس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضرتؐ پر سلام کا جواب منا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب نے واقعہ حذرہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی ٹھوکی اذان سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے بلکہ اس سے زیادہ ہو سکتا ہے؟

(اقتناء العلوٰۃ المستقیمہ ص ۳۲، اردو ترجمہ)

۳۔ "بہر حال میت کا قرآن اور دوسری آوازیں سننا تو حق ہے۔ لیکن مرنے کے بعد عمل پر اُسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے۔ لیکن مردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے؟ (حوار مذکور ص ۳۳)

محرم: یہ چند سوالات آپ کو بھیج رہا ہوں، اس پر کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں تبصرہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ والسلام!

دوسرے سائل محمد احسان الحق صاحب یروخیل میاںوالی (مال اسلام آباد) سے لکھتے ہیں کہ:

"محرم: ایک عرصہ سے میرے ذہن میں مسئلہ مذاپ قبر کے متعلق الجھن اور غلط فہمی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مذاپ قبر حق ہے۔ قبر منازلِ آخرت میں سے ایک بلکہ پہلی منزل ہے۔ اس منزل سے کامیاب گزرنے والا آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے گا اور حوییاں پکڑا گیا اُس کی آخرت کی بھی خیر نہیں۔ مذاپ قبر کے بارے میں مجھے جو اشکال ہے اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زندگی موت کی فمد ہے۔ جب مروج جسم میں پڑتی ہے تو جلا متی ہے اور جب نکالی جاتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر یوم البعث کو دوبارہ جسم میں آئے گی تو انسان

زندہ ہوگا۔ دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک مرحلہ ہے، جسے برزخ کہتے ہیں، اسے برزخی زندگی بھی کہا جاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ زندگیاں تو از روئے قرآن دو ہیں اور موتیں بھی دو، تو یہ برزخی زندگی کیا ہے؟

۲۔ عذاب قبر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا تعلق رُوح سے ہے؟ بعض مشائخ سے سنا ہے کہ رُوح کا عکس جسم پر رہتا ہے لہذا جسم کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو حساب کا کیا مطلب؟

۳۔ ”قُبُعًا ذُو حُفَّ فِي جَسَدٍ“ کا کیا مفہوم ہے؟ نسو من قرآنی سے ثابت ہے کہ جب رُوح اور جسم ملیں گے تو انسان فوراً اٹھ کھڑا ہوگا۔ جیسے سورہ یس میں ہے: ”وَنُفِثَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَى رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ“

۴۔ کتب حدیث میں ہے کہ جب مرنے کو دفن کر کے لوگ واپس ہوتے ہیں تو وہ اُن کے تجوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے کہ اُس کے پاس ٹھکراؤ اور تھکراؤ ہے۔ جب رُوح جسم سے نکل جاتا ہے تو حواسِ خمسہ بھی جاتے رہتے ہیں پھر وہ کس طرح سنا ہے؟ قرآن بھی تو کہتا ہے: ”أَمْ لَهُمْ خَزَائِنٌ مُّخْتَوْنَ بِهَا“

۵۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اپنی تصنیف ”الایات القویۃ علی ان حیوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قبرہ لیست بذبیحۃ“ میں مکتبہ پر بحوالہ کتاب ”الروح“ (از ابن قیم) فرماتے ہیں:

”برزخ کا تعلق اس میں گواہی دیتی ہے لیکن تجربہ کئی نہیں ہوتا بلکہ سلام کے جواب کے لیے اُسے نواہا جاتا ہے۔ لیکن یہ دنیوی زندگی نہیں ہوتی جو اُسے مرنے سے پہلے حاصل تھی۔“

۶۔ حدیث میں آتا ہے کہ مومن زندہ پر جب وہ بھیک جواب دیتا ہے تو قبر پر نظر تک فرما کر ہو جاتی ہے۔ اس طرح کافر پر قبر تنگ ہو جاتی ہے اُسے پہنچ لیتی ہے۔ پھر کہا وجہ ہے کہ ایک صحابی رسولؐ پر قبر تنگ ہو گئی؟

۷۔ جب از روئے قرآن مردہ نہیں سن سکتا (وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ) تو صیغہ ماضی ”عَفِی“ کے ساتھ ”أَسَلَّامٌ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ“ کیوں کہتے ہیں؟

۸۔ کتاب ”الروح“ (از ابن قیمؒ) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

محرم: اعموم سرحد کی روشنی میں میرے ان اشکالات کا تدارک فرمائیے !  
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ !

## الجواب بعون الوهاب

روح کے متعلق بحث ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ غفاقِ عالم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ :

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ أَلْعَلُوا إِلَّا قَلِيلًا“ (یہی اسرئیل: ۸۵)

”اور تمہیں مروج سے متعلق بھٹوڑا ہی علم عطا کیا گیا ہے ؟“

جس کا واضح مطلب ہے کہ روح کی حقیقت اور نہ تک پہنچنا انسان کے لیے اگر ناممکن نہیں تو محالِ معروض ہے۔ لیکن انسان کی عادت ہے کہ جس بات سے متعلق اس پر بندشِ عالم کی بات ہے، وہ اس بات کی کرد و تغیش میں دوسری باتوں سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک مسئلہ تقدیر کا تھا جس پر بحث کرنے سے عاجز ہو گیا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر حضرت انسان نے اپنی تحقیق و تغیش سے وہ وہ گل کھلائے کہ اسی مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر ائمہِ مسلمہ کے دو فرقے پیدا ہو کر آپس میں متحارب ہو گئے۔ روح کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اس پر بھی جن جن علماء نے قلم اٹھایا ہے، ان کی تفصیل میں بہت اختلاف واقع ہوا۔ محولہ بالا مضمون میں میں نے روح سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اب کچھ تفصیل پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے براہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## زندگی اور موت کے چار مراحل :

جسم اور روح کے انفصال کا نام موت اور اتصال کا نام زندگی ہے۔ مامِ ضابطہ الہی کے مطابق دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر آیا ہے۔ پہلے موت ہے پھر زندگی، پھر موت ہے پھر زندگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

”كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أََمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ“

فَعَدَّ الْيَدَيْنِ مَرْجِعُونَ ﴿۲۸﴾ (البقرة: ۲۸)

”تم خدا سے کیسے انکار کر سکتے ہو اس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر تمہیں دیتا ہے پھر زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے؟ اور قیامت کے دن کفار بھی یہی اقرار کریں گے کہ:

”قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَيْنِ وَاٰخَرَتَيْنِ اِثْنَتَيْنِ فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا

فَقُلْ اِلٰى خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ﴿۱۱﴾ (المومن: ۱۱)

”کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم کو دو بارہ موت دی اور دوبارہ زندہ کیا ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تو کیا اب (جہنم کے عذاب سے) بچنے کی کوئی سبیل ہے؟

آپ نے دیکھا کہ ان دونوں مقامات پر اللہ تعالیٰ نے زندگی سے پہلے موت کا ذکر کیا ہے زندگی کی طرح موت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جو زندگی سے پہلے پیدا کی گئی۔ گویا موت صحنِ مہم یا کسی سببی چیز کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایجابی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حیات سے پہلے پیدا کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لِيَّبْكُوْكُمْ اَتَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۱۱۱﴾

”اسی نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے؟

## پہلا مرحلہ موت ہے۔

پہلا مرحلہ موت ہے اور اس سے مراد وہ دور ہے۔ جب اللہ رُوحوں کی پیدائش کب ہوئی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان تمام رُوحوں کو بھی پیدا فرمایا، جو اس کی پشت سے تاقیامت پیدا ہونے والی تھیں۔ ”عبداللہ“ اسی دور سے متعلق ہے۔ (۱۱۱) اور یہ دور رُوح کی پیدائش سے لے کر اس کے شکمِ مادر میں جنین کے جسم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔ رُوح اگرچہ ایک زندہ و متحرک اور عقل و شعور رکھنے والی چیز ہے۔ لیکن چونکہ ابھی اس رُوح کو جسم نہیں ملا جو اعمال کے صدور کا ذریعہ ہے، لہذا اس دور کو موت سے تعبیر کیا گیا۔

اسی دور کے متعلق دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ

(الاحقاف: ۱۱)

ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں۔ پھر فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو؟

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

- ۱۔ تمہاری تخلیق فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے سے پیشتر وقوع پذیر ہو چکی تھی۔
  - ۲۔ اس تخلیق کے وقت تمہاری صورتیں بھی بنادی گئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ رُوح بھی شکل و صورت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی تائید ان احادیثِ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں مذکور ہے کہ فرشتے جب کسی نیک مسلمان کی رُوح قبض کرتے ہیں، تو اس رُوح کو ریشی لباس میں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس رُوح کی شکل کیسی ہوتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس رُوح کی شکل و صورت بھی بالکل وہی ہوتی ہے جو اس کو مٹنے والے جسم کی ہوتی ہے یا ہوگی۔ تو رُوح میں بھی ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ اور اس رُوح کی قالب میں مثال یوں سمجھئے جیسے زیتون کے درخت میں روغن زیتون یا کوئلہ میں آگ یا جلنے والی گیس۔
  - ۳۔ اللہ تعالیٰ نے رُوح کی تخلیق اور اس کو شکل و صورت عطا کرنے کے باوجود اس رُوح کو عام مٹا کے مطابق موت کے زمانے سے تعبیر کیا ہے اور یہی موت کی تخلیق کا مفہوم ہے۔
- اب ان چاروں مراحل کی کیفیت اس طرح ہوتی کہ:
- (۱) پیدائش رُوح سے لے کر اس رُوح کو مادہ شکم میں داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
  - (۲) شکم مادر میں جسم میں رُوح کے داخل ہونے سے لے کر موت تک کا عرصہ۔ اسے زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
  - (۳) موت سے لے کر قیامت کو دوبارہ اجسام میں رُوح کے داخل ہونے تک کا عرصہ۔ اس عرصہ کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
  - (۴) قیامت کو دوبارہ جی اٹھنے کے بعد لامتناہی مدت۔ اس عرصہ کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- اب دیکھئے کہ ان چاروں ادوار میں عدم یا فنا اگر ہے تو جسم کو ہے۔ رُوح جب سے پیدا

ہوئی۔ اُس کے معدوم یا فنا ہونے کا کوئی مرحلہ پیش نہیں آیا۔ جب رُوح اکیلی ہوتی یا رہ جاتی ہے تو اُسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو اُسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

## دوسرا مرحلہ :- دُنیوی زندگی

اس مرحلہ میں رُوح بدن میں داخل رہتی ہے۔ یعنی جنین میں رُوح کے داخل ہونے یا جان چرنے سے لے کر رُوح کے جسم سے نکل جانے یا مرنے تک کا عرصہ دُنیوی زندگی کہلاتا ہے۔ زندگی گننے کا اصل سبب تو یہی ہے کہ اس عرصہ میں رُوح و بدن کا کُلّی اتصال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتصال کُلّی کبھی منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ گویا اس موت و حیات کے قانون میں استثنا کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر ہم ذرا تفصیل سے کریں گے۔ تاکہ برزخ کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

### استثنائی صورتیں :

اُدھر جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عام منابطہ یا قانونِ قدرت یا سنت اللہ یا عادتِ عامہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے مجبور و بے بس نہیں ہے بلکہ ان تمام قوانینِ فطرت یا قدرت کے خلاف گام بے گام ہے اس کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ اور یہ بات اس آگ کی فطرت میں داخل ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت آگ کو یہ حکم دے کہ فلاں شخص کے حق میں ٹھنڈی اور سلامتی دالی بن جاؤ تو آگ کو اپنی اصل فطرت چھوڑ کر اللہ کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ پھر یہی کام کا شائبہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے حکم سے پھر یہی اس خاصیت کو سلب بھی کر سکتے ہیں۔ انعامات کا یہ کام ہے کہ افراق کے بعد اس کے اجزاء فوراً مل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی اللہ تعالیٰ دریا کو یہ حکم دے کہ پھٹ کر بہاؤ کے تودوں کی طرح ٹک باؤ و درمیان میں کشادہ راستہ بنا دے۔ تو دریا کو اللہ کے حکم کے سامنے سیر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا صرف ایک قانون ایسا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اُسے قانونِ قوموں کے غرور و نعدال سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم بدکرداری کی انتہائی پستیوں کو پہنچ جاتی ہے تو اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ خواہ یہ تباہی جلد ہو یا بدیر۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون کو مَسْئَلَةُ اللّٰہِ کہا ہے۔ اور قرآن کریم میں چار مختلف مقامات پر ذکر کر کے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ اس مسألت اللہ میں کوئی تغیر و تبدل یا لچک نہیں ہے۔

۱۔ احيائے موتی یا اسی ذموی زندگی میں مَرْدوں کا زندہ ہونا:

رہا موت و حیات کا قانون، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی استثنائی صورتیں قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہیں:

- ۱۔ حضرت عیسیٰ مَرْدوں کو ”قَتْلَہُ بِأَذْنِ اللہِ“ کہہ کر زندہ کر دیا کہتے تھے۔
- ۲۔ حضرت عزیر کا ایک اُچھڑی ہوئی اور دیوانہ شدہ بستی پر گندہ ہوا تو کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ اس مَرْد بستی کو کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پورے سو سال کے لیے موت عے دی۔ پھر زندہ کر کے پوچھا۔ اب بتاؤ کہ تم کتنا عرصہ یہاں پڑے ہو؟ کہنے لگے کہ یہی کوئی دن آدھ دن کی بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ نہیں بلکہ تم تو سو سال موت کی حالت میں پڑے رہے ہو۔ ذرا دیکھو تو تمھارے سوا کسی کے گدھے کے پنجرے کے سوا اور کوئی چیز نہ گئی؟ دیکھو اب ہم تمھارے سامنے اس پنجرے کو کھول کر گوشت پوست پہنا کر کے اُسے پھر سے زندہ کئے دیتے ہیں؟ (البقرہ: ۲۵۹)

- ۳۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص قتل ہو گیا۔ قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا۔ سب مشتبه لوگ ایک گھر پر الزام دھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ پھر اس مذبح کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ تو یہ لاش خود اپنے قاتل کا پتہ بتلا دے گی۔ چنانچہ جب اس لاش پر مذبح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارا گیا۔ تو مَرْد زندہ ہو گیا۔ اُس نے باتیں کیں اور اپنے قاتل کا پتہ بھی بتلا دیا۔ (البقرہ: ۳۱)

- ۴۔ حضرت موسیٰ جب تورات کے کوہ طور سے بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے، تو اس بد شرت قوم نے یہ اعتراض کر دیا کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ کتاب واقعی اللہ کی طرف سے اُتری ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اسے اللہ کی طرف سے اُترنے کو دیکھا نہیں۔ پھر یہ یقین کیسے ہو؟ موسیٰ نے قوم کے اس بے جودہ اعتراض سے نجات کی یہی راہ دیکھی کہ اللہ تعالیٰ سے التجا کریں۔ چنانچہ وہی الہی کے مطابق اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو چُنا اور کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں جا کر جب ان ستر آدمیوں نے اپنے مطالبہ کو دہرایا اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور تورات کے اُترنے کا منظر دیکھنے پر اصرار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ایک کرک بھج کر ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب حضرت موسیٰ پھر اللہ سے التجا کرنے لگے۔ ہا الہی! ان بے وقوفوں کی اس خواہش پر تُو نے انھیں مار دیا۔ اب میں کیسے واپس جاؤں اور قوم کو کیا کہوں؟ تو

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :  
 ثُمَّ بَعَثْنَا كُوفً مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكَ ؟ (البقرة : ۵۷)  
 ”پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا ؟“

نیز دیکھئے : الاعراف : ۱۵۵

۵۔ حضرت ابراہیمؑ نے محض ایمان قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کیا کہ اے میرے پروردگار تو مردوں کو کب زندہ کرتا ہے ؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ یوں کرو کہ چار پندے لے کر اُن سے ثوب مانوس ہو جاؤ تاکہ اُن کی شکل و صورت کو خوب پہچان سکو۔ پھر اُن کو ذبح کر کے اُن سب کا گوشت ابھی طرح ملا دو۔ پھر اُسے بٹے بٹے گوشت کو چار حصوں میں تقسیم کر دو اور ہر حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر واپس آ کر انہیں ایک ایک کر کے پکار دو وہی پندہ تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے گا جسے تم پکارو گے۔ اسی طرح چاروں پندے تمہارے بٹلنے کی ترتیب کے مطابق تمہارے پاس حاضر ہوتے ہائیں گے۔ (البقرہ : ۲۶۰)

۶۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں لوگ جہاد کے لیے نکل تو کھڑے ہوئے لیکن دشمن کے مقابلہ اور موت کے ڈر سے اُن کی جان گویا پہلے ہی نکل رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہیں موت عے دی، مگر جس بات سے ڈرتے ہو اس کا تو ابھی مزہ چکھو۔ پھر چونکہ اللہ تعالیٰ کو مرنے عبرت دلانا مقصود تھا۔ لہذا انہیں پھر سے زندہ کر دیا۔ (البقرہ : ۲۴۲)

یہ تمام واقعات قرآن کریم میں بھراحت موجود ہیں۔ ہم نے کسی واقعہ کی تشریح و تفسیر اپنی طرف سے بیان نہیں کی بلکہ مرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو عام قانون الہی یہی ہے کہ ہر شخص کو دوبارہ زندگی اور دوبارہ موت سے دوچار ہونا ہے۔ مگر کسی کے حق میں ۳ بار کی زندگی اور ۳ بار کی موت بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ گو ایسے واقعات شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں تاہم ان کے امکان سے انکار کسی کوئی وجہ نہیں اور جو لوگ ایسے واقعات کی تاویلات کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ گویا خدا تعالیٰ کی جاری و ساری قدرت کے منکر ہوتے ہیں۔

ب۔ نیم زندگی (خواب) یا برزخی موت :

اب دیکھئے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر انسان کو موت کا ہلکا سا نقشہ دکھلا دیا گیا ہے اور یہ موت نیند کی حالت ہے جسے ہم برزخی موت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نیند کو موت کی بہن قرار دیا ہے۔ نیز سونے کے بعد جاگنے پر جو دعا رکھ لیتی۔ یعنی۔  
 اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَاْنَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُورُ۔ اس دعا میں نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ نشور کا لفظ بعث بعد الموت کے لیے آتا ہے۔



**برزخ کا لغوی مفہوم** | برزخ کے معنی بالعموم پردہ یا آڑ کر لئے جلتے ہیں۔ جبکہ عربی زبان میں پردہ کے لیے اُدھی بہت سے لفظ موجود ہیں مثلاً ستر، حجاب، غطاء، غلف، اُکلتہ وغیرہ۔ اور ان سب الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق موجود ہوتا ہے۔ برزخ دراصل دو مختلف یا متضاد چیزوں کے درمیان ایک ایسی تیسری چیز کا نام ہے۔ جس میں پہلی دونوں اشیاء کے بٹے جٹے اوصاف پاتے جاتے ہیں اور وہ آڑ کا کام بھی طے۔ خواہ یہ اوصاف برابر برابر ہوں یا کسی ایک چیز کے کم اور دوسری کے زیادہ۔ جیسے جنت اور دوزخ کے درمیان اعراف برزخ ہے۔ جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برزخ ہے۔ جو برحق اور شاخیں تو نباتات کی طرح پھیلاتا ہے۔ مگر نوع کے لحاظ سے پتھر ہے اور جمادات میں شامل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ میٹھے اور کھاری پانی کے درمیان ایک برزخ کی رو پیدا کر دیتا ہے جسے قرآن کریم میں برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیند اسی لحاظ سے برزخ ہے کہ اس میں زندگی اور موت کے بٹے جٹے آثار پاتے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں غالب اثرات زندگی کے ہی ہوتے ہیں موت کے نہیں۔

**برزخی موت یا نیند** | اسی نیند کے معاملہ پر غور کرنے سے رُوح کی بحث بھی شروع ہو جاتی ہے سب علماء اور اطباء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں: ایک تو رُوح حیوانی ہے جس کا تعلق گردش خون سے ہے۔ دوسری رُوح کو بعض حضرات نے نفیس زیریں سے بھی تعبیر کیا ہے، جب تک گردش خون برقرار رہے رُوح چھوڑ دے گا یہ رُوح نعل جاتے تو گردش خون ختم ہو جاتی ہے۔

**رُوح انسانی یا نفس** | دوسری قسم رُوح نفسانی ہے۔ جسے نفیس بالا یا رُوح انسانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ رُوح کی یہ قسم وہ ہے جو خواب میں سیر کرتی پھرتی ہے۔ رُوح کی یہ قسم یا رُوح کا یہ حصہ جب انسان کے جسم کو چھوڑ دیتا ہے تو انسان کے حواس خمسہ میں نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نیند کے دوران قوتِ باصرہ، لامسہ اور ذائقہ کی کارکردگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوتِ سامعہ بھی مائل ہو جاتی ہے۔ یاں اگر غل غلاٹہ ہو یا کوئی دوسرا آدمی سوئے ہوئے آدمی کو آواز دے کہ جگاٹے تو یہ رُوح نفسانی دوبارہ خود اپنے جسم میں لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح تیز قسم کی خوشبو یا بدبو بھی بسا اوقات انسان کے ہلگنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ بھی واقع ہے کہ اس رُوح نفسانی کو اپنے غالب سے مشتق کی مدت تک محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی غالب اس رُوح نفسانی کی آرزو کی مکمل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی نفس کو مخاطب کیا ہے تو اس

سے مراد ہمیشہ یہی نفسِ بالا یا رُوحِ انسانی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں رُوحوں کا آپس میں نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی اکائی کے دو مجزود ہوتے ہیں۔ رُوحِ نفسانی اگر خواب میں کسی بات یا کسی چیز سے تعلق اندوز ہوتی ہے تو انسان جب جاگتا ہے، ہشاش بشاش نظر آتا ہے، اور اگر رُوحِ نفسانی کو خواب میں کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے تو بعض دفعہ انسان سوتے میں ہی پچھنے چلنے لگتا ہے، اور جاگتا ہے تو سخت اندوہناک ہوتا ہے، اور اگر کہیں خواب میں مار پٹے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مار پٹائی کے اثرات اور نشانات بعض دفعہ انسان کے جسم پر نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں انسان جاگنے کے بعد خود بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

خواب سے ہر انسان کو بکثرت واسطہ پڑتا رہتا ہے، اس خواب رُوح سے متعلق چند حقائق

۱۔ خواب میں اس رُوحِ نفسانی کی شکل و صورت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسے بستر پر پڑے ہوئے (سوتے ہوئے)، اس کے قاب کی ہوتی ہے۔ اور خواب کے دوران جب رُوحیں آپس میں ملتی ہیں تو اس شکل و صورت کی ہم آہنگی کے واسطے سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں۔

۲۔ ضروری نہیں کہ ان ہی رُوحوں کی آپس میں ملاقات ہو جو اس دُنیا میں زندہ کہلاتے ہیں۔ یہ ملاقات اُن لوگوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس جہان سے رحلت کر چکے یا مر چکے ہیں۔ زندہ کی رُوح مردہ کی رُوح سے بھی ملاقات کر سکتی ہے اور اس کے برعکس بھی۔

۳۔ خواب میں جو واقعات رُوح کو پیش آتے ہیں، ان واقعات کے بیشتر اثرات سے اس رُوح کا مادی قاب بے بہرہ رہتا ہے، خدا ایک شخص خواب میں خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے، لیکن جب جاگتا ہے تو بھوکا ہوتا ہے۔ البتہ کچھ نہ کچھ واقعات ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جن سے انسان کا مادی قاب بھی متاثر ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، تاہم عام قاعدہ یہی ہے کہ مادی قاب رُوحِ نفسانی سے خواب کے دوران پیش آمدہ واقعات سے متاثر نہیں ہوتا۔

۴۔ خواب میں رُوح راحت و آلم یعنی خواب و غلاب سے دوچار ہوتی ہے، حتیٰ کہ غریبی، بانی

ہے اور کبھی تو خواب میں زندہ ہوجاتی ہے۔ اور کبھی بیدار ہی پر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواب میں تو مگر گیا تھا مگر حقیقتاً زندہ ہے۔

یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان مشاہدات و تجربات کی دہوہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کرے تو اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: ”وَمَا أَفْقَرُ مِنْكَ مِنَ الْعَالَمِ إِلَّا قَلِيلٌ“

ان ہر دو اقسام کی رُوحوں کے بارے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک قسم کی رُوح غائر سے دوسری قسم کی رُوح از خود ختم ہوجاتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص کو سوا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا ہے کسی دوسرے شخص نے اُسے سوتے میں قتل کر دیا۔ تو رُوح نفسانی خواہ کبھی بھی تیر کر نہ ہوگی۔ اب یہ دوبارہ اس جسم میں داخل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ اُسے وہیں قبض کر لے گا۔ اسی کے برعکس صورت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کی رُوح نفسانی کو خواب میں قبض کر لیں تو بستر پر سونے والا آدمی بغیر کسی حادثہ یا بیماری کے مر جائے گا۔ ارشاد باری ہے:

”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا قَدْ فَتَّمْنَا  
الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى“

(النجم: ۴۲)

”اللہ تعالیٰ موت کے وقت کسی شخص کی رُوح کو قبض کر لیتا ہے اور اس شخص کی رُوح کو بھی جو خواب میں ہے اور ابھی مرا نہیں۔ پھر جن پر موت کا حکم کر چکا ہے اُن کو روک رکھتا ہے اور باقی رُوحوں کو جو (خواب دیکھ رہی ہیں) ایک مقررہ وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے؟“

آیت مذکورہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ یہ آیت اس بات پر سب سے قوی دلیل ہے کہ رُوح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ رُوح جو کبھی حالت میں بھی بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور یہ رُوح حیوانی یا نفیس زیریں ہے۔ دوسری وہ رُوح جو خواب میں بدن کو چھوڑ کر تیر کر رہتی ہے اور ہر طرح کے واقعات سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ رُوح نفیس بالایا رُوح انسانی کہلاتی ہے۔ اسی رُوح کو اللہ تعالیٰ مخاطب فرماتا ہے۔ اور اسی رُوح کو دوام ہے۔

۲۔ رُوح حیوانی یا نفیس زیریں کا تعلق محض بدن سے ہے۔ بدن نہ ہو تو اس رُوح کا کوئی وجود

ہی نہیں رہتا۔ بلکہ یہ رُوح تو بدن کے بوسیدہ ہونے یا فنا ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے ختم ہونے سے بدن بدن نہیں کہلاتا بلکہ جسدِ میت۔ لاش یا غش کہلاتا ہے۔

۲۔ بیداری کی حالت میں یہ دونوں قسم کی رُوحیں انسانی جسم میں موجود رہتی ہیں۔ اوسطاً ہر انسان اپنی زندگی کا تیسرا حصہ وقت سو کر گزارتا ہے۔ گویا اس دنیوی زندگی کا تیسرا حصہ وقت برزخی موت ہے۔ پھر اس دنیوی زندگی میں اس برزخی موت کی حالت میں بھی زندگی کے آثار موت کے آثار سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی میں تعسیراً بارہواں حصہ وقت انسان پر موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔

## تیسرا مرحلہ: موت سے لے کر حشر تک عرصہ موت

چونکہ اس عرصہ میں رُوح کو بدن میسر نہیں آتا۔ لہذا یہ عرصہ موت ہے۔ مگر دنیوی زندگی کی طرح اس عرصہ موت میں بھی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

### ۱۔ عذابِ قبر

اب دیکھئے جس طرح انسان دنیوی زندگی میں موت کے اثرات سے دوچار ہوتا ہے بعینہ اسی طرح عرصہ موت (مرنے کے وقت سے لے کر رد و قیامت تک کی موت) میں زندگی کے اثرات سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ نے کئی طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ رُوحیں سچیں اور علیین میں ہوتی ہیں۔ تاہم ان رُوحوں کا ہلکا سا تعلق اپنی اپنی قبروں سے قائم رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان رُوحوں کا عکس قبر پر بھی پڑتا ہے بعض دوسرے علامہ نے اس حقیقت کو توں ادا کیا کہ اس عرصہ موت میں رُوح اور بدن کا انحصار کلی نہیں ہوتا۔ گویا رُوح اور بدن کا تعلق قائم تو مستقل طور پر رہتا ہے مگر یہ تعلق بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔

مجھے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ

عذابِ قبر کی حقیقت (۱) اس عرصہ موت میں رُوح و بدن میں کلی طور پر انفصال ہو جاتا ہے

مگر جس طرح دنیوی زندگی میں بحالتِ خواب کبھی کبھار رُوح بدن کو چھوڑ جاتی ہے۔ بعینہ اس طرح موت میں کبھی کبھی رُوح اپنے بدن سے آٹتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں

انسان سونے یا آرام کرنے کے لیے کسی حد تک خود مختار ہوتا ہے۔ لیکن خواب اور اس میں منہج کے واردات اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جبکہ اس بدنہی عالم میں کچھ بھی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ سب کچھ منہج اللہ ہوتا ہے۔ گویا روح و بدن کا یہ تعلق قہر ہکا اور کمزور ہی نہیں ہوتا بلکہ غیر مستقل ہوتا ہے اور اضطراری بھی۔

۲۔ پھر جس طرح، ایک دن رات یا ۴۰ گھنٹہ کے عرصہ میں انسان رات کو یا کسی وقت دن کو سوتا ہے تو خواب کی صورت میں اس کی روح بدن چھوڑ جاتی ہے، اسی طرح اس عرصہ موت میں دن میں ایک دوبار اپنے قالب یا قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

۳۔ پھر جس طرح خواب کی حالت میں روح کے بدن کو چھوڑنے کے وقت بھی حقیقتاً حیات کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں روح کی بدن سے ملاقات کے دوران بھی موت کے آثار غالب دیتے ہیں۔

۴۔ نیز جس طرح خواب میں روح راحت و آلم سے دوچار ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے اثرات بدن پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس عرصہ موت میں روح کو مذاب و ثواب ہوتا ہی ہے، تاہم اس ملاقات کا مدخل اس کے اثرات جسم یا اس کے فرائض پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور یہی مذاب و ثواب کی حقیقت ہے۔

اب دیکھئے امام بخاری نے قرآن کی دس ذیل آیت سے عذاب قبر قرآن اور عذاب قبر کا استشہاد کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

الَّذِينَ يَمُوتُونَ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ وَعَلَوْا أَوْ عَصَوْا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (المومن: ۴۶)

”وہ صبح و شام آگ (راقیں جہنم) پر پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت برپا ہوگی تو ہم حکم دیں گے کہ آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔“  
اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ اَلَّذِينَ يَمُوتُونَ عَالُونَ کے الفاظ ہمارے اسی موجودہ نظام شمسی کے حساب سے ہیں۔ دن بھر میں ایک دوبار عذاب پر پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ روح اور بدن کا اتصال مسلسل نہیں ہے۔ ورنہ فرعون جیسے ظالم اور کافر کو تو قبر میں عذاب مسلسل ہی دیا جانا چاہیے تھا۔

۲۔ انھیں صرف مذاب پر پیش کیا جاتا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح خواب میں

راحت و آلم کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے اسکی قبر میں عذاب و ثواب کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوتے۔ یعنی عذاب و ثواب کا اثر قیامت (زندگی) کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوتا ہے۔  
۳۔ البتہ قیامت کے دن ان لوگوں کوئی انحیثت آتش جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ زندگی کا عرصہ ہے اور اس عرصہ میں رُوح و بدن کا تعلق مسلسل اور مستقل طور پر قائم ہے لہذا عذاب و ثواب شدید بھی ہوگا اور مستقل بھی۔

دوسری آیت جس سے امام بخاری نے عذاب قبر کا استشہاد کیا ہے وہ استشہاد کی حد تک تو درست ہے مگر اس سے مسئلہ کے حیرت ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:  
”وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخَذُوا أَنْفُسَهُمْ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ“ (الانعام: ۹۲)  
”ساکش تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب موت کی سلیقوں میں مبتلا ہوں۔ اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی؟“

یہ آیت درج کرنے کے بعد امام بخاری لفظ ھُون کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:  
”قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْهُونُ هُوَ الْهَوَانُ وَالْهُونُ الرِّقُّ“۔

(بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ما ہمار فی مذاب القبر)

”امام بخاری نے کہا کہ ھُون کا معنی ھَوَان یعنی ذلت اور سُوائی ہے۔ اور ھُون کا معنی نرمی اور ملائمت ہے۔“

آیت بالا اور امام صاحب کے اجتہاد سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ عذاب (و ثواب) قبر مرنے کے وقت سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ”الیوم“ کے لفظ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

۲۔ یہ عذاب بھی گود ذلت و رسوائی کا ہوگا۔ تاہم اشد العذاب یا عذاب عظیم کی نسبت بہت ہلکا اور کمزور ہوگا۔

ہم اسے اس خیال کی تائید بہت سی امارتیں معہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں یہ مذکور ہے کہ مومن کے پاس قبر میں فرشتے آتے ہیں، تو پہلے اس پر دوندخ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں بد اعمالیاں کرتے تو تمہارا ٹھکانا یہ دوندخ ہوتی۔ پھر اس پر جنت کو پیش کر کے کہا جاتا ہے

کہ چونکہ تم نے دنیا میں اپنی زندگی احکام الہی کی اطاعت میں بسر کی ہے۔ لہذا اب تمہارا مقام جنت ہوگا۔ پھر جنت سے ایک روزن اس کی قبر میں کھول دیا جاتا ہے۔ اور کافر سے معاملہ بعینہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

**قبر اور جدت** | انسان کو جب قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے جسم کو مٹی یا کھیتے کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک مدت بعد بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل کر مٹی بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات قبروں کے نشان تک بھی مٹ جاتے ہیں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مروج کا یہ جزئی اتصال آخر کون سے بدن سے ہوتا ہے۔ اور جب قبر کے نشان تک مٹ کر اس پر بازار بن چکے ہیں یا کھیتی کاشت کی جا چکی ہو تو وہ قبر ہے کون سی جس میں مذاب ہوتا ہے؟

اس سے آگے چلے بعض لوگ اپنے مردوں کو دفن ہی نہیں کرتے بلکہ لاش کو ملا دیتے ہیں پھر اس کی لاکھ کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کی موت یوں واقع ہوتی ہے کہ انھیں دند بچاڑ کھاتے ہیں۔ اور میت اس درندے کا جزو بدن بن جاتی ہے۔ بعض لوگ پانی میں ڈوب کر مر جاتے ہیں تو آبی حیوانات کی خورداک بن کر ان کا جزو بدن بن جاتے ہیں۔ تو آخر وہ کون سی قبر یا بدن ہے۔ جس کے ساتھ اس عرصہ موت میں مروج کے اتصال کا امکان باقی رہ جاتا ہے؟

اب اس سے بھی آگے بڑھیے کہ جو درندے یا آبی جانور کسی میت کی قبر بنے ہیں۔ وہ بھی بالآخر مکرر مٹی میں مل جائیں گے۔ تو قبر یا بدن والی آخر کونسی بات رہ جاتی ہے جس سے مروج کا اتصال ہو؟ جب ہم یہ سوچتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان کی لاش مٹی میں مل کر مٹی کے ذرات میں ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کلیہ میں اگر استثناء ہے تو صرف یہ کہ انبیاء قبروں ہی میں دفن ہوتے ہیں۔ اور ان کے اجساد کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ جیسا کہ احادیث صریحہ سے ثابت ہے۔ پھر اس کے بعد کچھ ایسے صلحاء بھی اس ضمن میں آ سکتے ہیں جن کے اجساد کو کھانا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے مگر اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ انبیاء کے اجساد کو زمین کیوں نہیں کھاتی؟ یہ ایک الگ بحث ہے جو خالص انبیاء سے تعلق رکھتی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی صورت جب تک اس کا جسد قبر میں بحال رہتا ہے، یا پھر قبر کے نشانات قائم رہتے ہیں۔ اس حالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قبر کا استعمال فرمایا ہے۔ ارشاد باری ہے:

”وَمَا آتَتْ بِمَنْعَةٍ مِّنْ فِي الْقُبُورِ“ (فاطر: ۲۲)

”اے محمد! آپ اُن لوگوں کو مشاہد نہیں کئے جو قبروں میں ہیں؟“  
اور دوسری حالت آخری حالت ہے۔ جبکہ نہ تو قبر کا نشان باقی رہ جائے اور نہ جسم کا، بلکہ وہ مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے۔ تو اس حالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”حدیث“ کا لفظ استعمال فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْزَادِ إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ يَكُونُونَ“ (ہٰجیہ)

”پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو لوگ اپنی اپنی اشیاء سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑ پڑیں گے۔“

گویا قیامت کے برپا ہونے کے وقت لغو رٹائی پھونکا جائے گا جس کا اثر یہ ہوگا کہ مٹی میں بیٹے ہوئے ذرات فوراً متحرک ہو کر آپس میں مل کر جسم کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ پھر ان اجسام کی مٹیوں اُن میں مستقل طور پر داخل ہو جائیں گی۔ پھر یہ لوگ اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے میدانِ معشر کی طرف دوڑتے ہوئے پہنچ کر اپنے رب کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

اب رہی یہ بات کہ حدیث کی صورت میں رُوح کا انتقال (اگرچہ عذابِ قبر کا عقلی ثبوت)

جواب تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہے۔ کیونکہ اہلِ حدیث صحیحہ سے اور قرآن سے بھی عذاب و ثوابِ قبر کا دوام ثابت ہے۔ اور عقلی لحاظ سے بھی یہ ممکن ہے۔ کیونکہ جسم کے کسی ادنیٰ سے جتنے یا ذرے پر خلعت سے رُوح متاثر ہو جاتی ہے۔ اور اب تو سائنس کے جدید انکشافات نے اس مسئلہ کو اور بھی قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جسم کی ساخت میں غلیظت کا کردار اور اُن کا بناؤ بگاڑ۔ نیز نفسا میں انگ پھینکا شدہ انسانی اور غیر انسانی آوازوں کا محفوظ ہونا اور ان آوازوں کو انگ انگ کر کے کا امکان ایسی باتیں ہیں جو حدیث سے بحث بعد الموت کے امکان کو ٹھوس ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں۔ اور اس بات کا بھی کہ ان ذرات سے رُوح کے انتقال کا امکان، ممکن ہے۔

عذابِ قبر کا تعلق رُوح اور بدن دونوں سے ہے | بدن یا جسم میں اگر یہ غفل و شعور اور ارادہ و اختیار نہیں ہوتا، لیکن چونکہ

۱۔ قبر اور حدیث کا یہ لغوی فرق شاید لغت کی کسی کتاب سے ذہل کے گا۔ یہ جو کچھ فرق میں نے بیان کیا ہے قرآن کریم کے طرزِ بیان کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے۔ دانشاظم بالعقوب۔ اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔



وہ ایک آلہ کار کی حیثیت سے رُوح کے نیک و بد اعمال کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہذا اس برزخی زندگی میں وہ بھی اپنی موجودگی کی مناسبت سے عذاب و ثواب میں شریک ہوتا ہے۔ اس برزخی زندگی میں رُوح تو مستقل طور پر زندہ رہتی ہے مگر بدن کو یہ پائیداری حاصل نہیں۔ لہذا اس عذاب و ثواب کا بیشتر حصہ رُوح ہی کے حصہ میں آتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ عرصہ موت ہے جس میں زندگی کے آثار بھی کچھ بھی ہوں بہت کمزور ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیوی زندگی میں خواب میسی نیم زندگی ہونے کے باوجود اس عرصہ کا نام زندگی ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں زندگی کے آثار زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ مرعلہ (دنیوی زندگی) میں موت (نمید) اور مرعلہ میں برزخی زندگی کے وجود کی طرف رسول اللہ کے درج ذیل ارشاد میں پوری طرح صراحت موجود ہے۔ فرمایا:

”الْأَنفُسُ نِيَامٌ إِذَا مَاتُوا إِنَّكَ تَحْيَا“

”لوگ سوتے ہوئے ہیں، جب مرے گئے تو ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

برزخی زندگی کی حقیقت صرف اتنی ہے جتنی اس دنیا میں خواب کی ہے۔ پھر جس طرح خواب میں رُوح کچھ ٹکھ سے دوچار ہوتی ہے، اور یہ سمجھتی ہے کہ وہ فی الواقعہ ان ولادات سے نجات پائی ہے لیکن اس کے باوجود واقعات کی خارجی دنیا میں اس کا کچھ وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح برزخی کیفیت میں جہاں تک رُوح کے عذاب و ثواب کا تعلق ہے، وہ فی الواقعہ مکمل طور پر اس سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن خارجی دنیا میں اس کا وجود نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے انسان دو ہی طرح کے ہیں، ایک مومن، دوسرے کافر۔ مومن کے لیے قبر فراخ کر دی جاتی ہے اور کافر کے لیے قبر تنگ کر دی جاتی ہے کہ میت کی ہڈیاں ایک دوسری میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اور یہ واقعات نیت کی تدفین کے فوراً بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس نیت کی قبر کو اکھاڑ کر دیکھیں گے تو قبر کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

پھر جس طرح خواب میں بعض اوقات رُوح کے علاوہ بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح برزخ کے عذاب و ثواب میں بھی بعض دفعہ بدن پر اثر ہو جانا ممکن ہے۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کبھی رُوح و بدن کا اتصال ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ مدت ”موت“ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر عذاب و ثواب قبر ہی سے شروع ہو جاتا ہے، آزائش اور حساب کا فرق | تو پھر آخرت میں اور کونسا حساب لینا باقی رہ جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں حساب نہیں لیا جاتا۔ صرف سرسری جانچ کی جاتی ہے۔ مگر نکیر کرتے ہیں اور

تین بنیادی باتوں کے متعلق تین موٹے موٹے سوال پوچھتے ہیں۔ یہ گویا عمر سہری ساز بانی امتحان ہوتا ہے۔ جس سے میت کو دنیا میں اپنی کارکردگی اور آئندہ زندگی میں ان اعمال کے اثرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں میت کو خوشی یا غمی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ قبر میں عذاب و ثواب کی حکمت یہ ہے کہ:

۱۔ مومن کو جنت دکھلا دی جاتے اور اُسے جنت کی خوشخبری دے کر نہ صرف یہ کہ اُس کے ذہنی اطمینان و انبساط کا سامان مہیا کیا جاتے بلکہ جنت کی کچھ تھوڑی بہت نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جائے۔ اور ان نعمتوں کی نسبت اتنی ہی ہوتی ہے جتنی اس عمر صدموت کو زندگی سے نسبت ہے۔

۲۔ کافروں کو پہلے جنت دکھلا کر پھر دوزخ پیش کی جاتے تاکہ ان کو مزید حسرت دیاں ہو۔ اور جہنم دوزخ کا عذاب بھی پہنچایا جاتے۔

۳۔ گنہگار مسلمان کو عذاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔ اور وہ بعثت بعد الموت کے جنت میں جانے کے قابل بن سکے۔ اور اگر وہ زیادہ گنہگار ہے تو آخرت میں اس گناہوں کے بدلے میں اس حد تک تخفیف کر دی جاتے، جس حد تک وہ عذاب قبر میں ٹھیک چکا ہے۔

اور حساب کا معاملہ آزمائش سے سخت اور شدید تر ہے۔ کیونکہ حساب اللہ تعالیٰ خود لے لیں دنیوی زندگی کا سارا ریکارڈ سامنے رکھ کر حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت ہوگی۔ اعمال کیلئے میزان ہوگا۔ شہادتیں مہیا کی جائیں گی۔ اور یہ سب میدانِ محشر میں اس چوتھے مرحلہ میں ہوگا۔ جس کا نام بعثت بعد المات یا اخروی زندگی ہے۔ جب مدح اور بدنِ معمل ہوں گے اور عذاب و ثواب کا اثر شدید، ہم گیر اور دائمی ہوگا۔

پھر اس حساب یا عدالتی انصاف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو محض اللہ کے حضور پیشی اور سرسری پوچھ گچھ ہے۔ جو انصاف کے بجائے اللہ کی رحمت کو نمایاں کرتی ہے۔ لوگوں سے بالعموم اسی قسم کا حساب لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ رعایتی منبر سے کو بھی پاس کرتے جاتے ہیں گے۔ اور حساب کی یہی قسم ”حِسَابًا یَسِیْرًا“ کہلاتی ہے۔ جس کے لیے مسلمانوں کو دُعا رکھلائی گئی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس دن بھی انصاف پر اتر آئیں۔ اور ہر شخص کے اعمال کو ہی جنت میں داخلہ کا سبب قرار دیا جائے تو شاید کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہ ہو سکے۔ اِلا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے دُعا نہ دے۔

## (ب) سماع موتی

سماع موتی کا مسئلہ مذاہب قبریہ و روح کی حقیقت کی طرح محض ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا سب سے بڑا چمور و زارہ ہے۔ لہذا قرآن مجید نے سماع موتی کے تمام امکانی پہلوؤں کو پوری قوت سے ختم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات قلیل غور میں:

۱۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ أَمْ لَا يَرَوْنَ أَنَّ اللَّهَ بَرُّهُمُ خَيْرٌ مِنْ ذَلِكَ وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا بَعْضَهُمْ فَبَعْضًا يَدْعُونَ ۖ (النحل ۲۱، ۲۲)

”اور جنہیں خود کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

۲۔ وَمَا يَسْتَوْفَى الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ يُنْعِمُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۚ (فاطر ۲۲)

”زندہ اور مرے برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تو جس کو چاہے نساکتا ہے لیکن دے گا۔ تم ان لوگوں کو نسا نہیں سکتے، جو قبروں میں مدفون ہیں۔

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

۳۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ۖ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ۖ (الاحقاف ۲۵، ۲۶)

”اور اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو گا جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے، بلکہ ان کو ان لوگوں کے پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ (روز قیامت) اکٹھے کئے جائیں گے تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے۔ اور ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے؟

مندرجہ بالا آیات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ غائب یا فوت شدہ لوگوں کو پکارنا ان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ بالفاظ دیگر شرک ہے۔

- ۲۔ غائب یا فوت شدہ لوگ کسی کی پکار کا جواب دینا تو درکنار ان کی بات سن بھی نہیں سکتے۔  
 ۳۔ قبروں میں پڑے لوگ زندہ نہیں ہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں۔ انھیں اپنی ذات کے تحقق بھی کچھ علم نہیں کرکب اٹھائے جائیں گے۔  
 ۴۔ البتہ ایک استثنائی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مردوں کو سنا سکتا ہے اس کے علاوہ ان کے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

**استثنائی صورت** اب دیکھتے یہ استثنائی صورت وہی ہے جسے ہم ذبیوی زندگی میں خواب کی مثال میں پیش کر چکے ہیں۔ خواب میں بھی مومن اپنی مرضی سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ پھر جس طرح خواب میں مومن آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتی اور ایک دوسرے کی سنتی بھی ہیں۔ لیکن سویا ہوا آدمی پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا۔ کیونکہ عالم خواب اور عالم ہے اور عالم دنیا اور عالم۔ اسی طرح مردہ لوگ جو عالم دنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم (عالم برزخ یا عالم مثال) میں ہوتے ہیں، وہ دنیا کے لوگوں کی باتیں کیونکر سن سکتے ہیں؟ عام منابطہ الہی یہی ہے کہ مردے کسی کی بات سن نہیں سکتے۔ اب دیکھئے کہ:

**استثنائی صورتوں کے نتائج** (۱) دوبارہ زندگی اور دوبارہ موت ایک عام منابطہ الہی ہے مگر مرحلہ میں مردوں کا زندہ ہونا استثنائ کی صورت ہے۔ جسے چند عقل پرستوں یا نیچر پرستوں کے علاوہ سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔  
 ۲۔ اسی مرحلہ یا ذبیوی زندگی میں دوسری استثنائی صورت خواب یا نیم موت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے اور چونکہ یہ ہر شخص کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ خواب میں چونکہ موت کے اثرات بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ لہذا یہ نیند کا عرصہ بھی حیات ہی میں شمار ہوتا ہے۔

۳۔ مرحلہ یا ذبیوی مرنے سے یوم البعث کے عرصہ کو قرآن نے موت سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس میں بھی زندگی کے ہلکے سے آثار پاتے جلتے ہیں۔ قبر کے عذاب کا ثبوت قرآن بھی ملتا ہے۔ اور احادیث صحیحہ سے بھی واضح طور پر ثابت ہے۔ اس استثنائی صورت کو بھی سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ منکرین حدیث کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے قرآن کی آیات کی تاویل کر لی۔ اور احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اس استثنائی صورت کا

۴۔ مرحلہ ۳ میں دوسری استثنائی صورت سماعِ موثق ہے۔ اس کے متعلق عام ملاحظہ الہی بھی ہے کہ مرفوعے میں سن نہیں سکتے۔ اور استثنائی صورت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان مرفوعوں کو سُنا سکتا ہے۔ پھر کچھ احادیث صحیحہ بھی ایسی ہیں جن میں یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ مرفوعے سن سکتے ہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں امت میں اختلاف واقع ہوا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرنِ اول میں بھی اختلاف موجود تھا۔ مثلاً حضرت قتادہؓ اور حضرت عائشہؓ تو سماعِ موثق کے حکم تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موثق کے قائل تھے۔ البتہ یہ بات مزید ہے کہ صحابہؓ میں اختلاف سننے کی حد تک تھا۔ یہ بات قطعاً مختلف فیہ نہیں تھی کہ وہ سن کر جواب بھی دے سکتے ہیں مگر آج یہ مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ سماعِ موثق کے قائلین مرفوعہ بھی نہیں کہتے کہ مرفوعے سن سکتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرفوعے اہل دنیا کی بات سن کر جواب بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں سائل کی حاجت برآری کرنے کی قدرت اور معرفت بھی رکھتے ہیں۔ یہ طبقہ گروہِ مونیہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا پیری مریدی کا سلسلہ ان اعتقادات کے بغیر چلنا ممکن ہی نہیں۔ ہم سردست مرفوعوں کے جواب دینے اور حجت برآری کرنے کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سماعِ موثق کی حد تک ان قائلین کے دلائل کا ہاتھ دیکھ کر پیش کرتے ہیں:

## سماعِ موثق کے قائلین کا طریق استدلال

قرآن مجید چونکہ سماعِ موثق کی محنت اور کلفتی تحدید کرتا ہے اس لیے یہ حضرات ایسی تمام آیات کی تائید کر جاتے ہیں جو سماعِ موثق کی تحدید کرتی ہیں۔ مثلاً:

(ا) موثق سے مراد حقیقی مرفوعے نہیں بلکہ دل کے مردہ یا کافر لوگ ہیں اور ان کو سُنا نہیں سکتے۔  
 کا مطلب یہ ہے کہ آپ انھیں راہِ راست پر نہیں لاسکتے اور اللہ کے سنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی انھیں راہِ راست پر لاسکتا ہے۔

(ب) جن بے جان ہستیوں کے پکارنے کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے مراد بزرگ نہیں بلکہ وہ اصنام یا شمس و قمر اور مظاہر قدرت ہیں جن کی پرستش کی جاتی رہی ہے۔ یہی وہ

جیڑی ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ جواب دے سکتی ہیں۔ اور بے ہان اور بے شعور ہیں۔ رہے بزرگ  
توان کی زندگی میں جب ان کی پرستش ہی نہیں ہوتی تو ان آیات سے یہ بزرگ کیسے مراد  
لئے جاسکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

**تاویلات کا جائزہ** | قدرت کی جیسے شمس و قمر، ہوا، پانی، آگ اور رحمت و غیرہ یا جنوں اور  
فرشتوں کی یا پھر فوت شدہ بزرگوں کی۔ یہ بزرگ گواہی زندگی میں اپنی عبادت سے منع کرتے رہے  
مگر جب لوگوں نے ان کی وفات کے بعد ان کی قبروں پر پکارنا شروع کیا تو ان کی اسی پکار کو قرآن  
نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف پوجا پاٹ نہیں ہوتا بلکہ کسی کو نفع پہنچانے  
یا نقصان سے بچانے کے لیے پکارنا ہی عبادت اور اس میں شامل ہے۔ اور بالعموم انہی دو  
باتوں کے لیے کسی کو پکارا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ :

۱۔ آیت میں "اَمْوَآتٌ فَاِذَا نَادٰی" کا اطلاق نہ جنوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر، اور الفاظ  
"بَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ" کا اطلاق جنوں یا دیگر مظاہر قدرت پر نہیں ہو سکتا۔ اب باقی صرف  
فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔  
۲۔ آیت ۲ میں گوشتی سے مراد مردہ منیر کا فرض بھی لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس آیت یا سیاق و  
سباق میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر یہ مجازی معانی اختیار  
کئے جاتیں۔

۳۔ آیت ۳ میں "وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ" کے الفاظ کو جنوں اور فرشتوں کو معبودان  
باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دُعائے من سکتے ہیں۔ اور "كَانُوا لَكُمْ اَعْدَاءُ"  
کے الفاظ جنوں اور مظاہر قدرت کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ کیونکہ  
ان بے ہان اشیاء کی نہ اس دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ ہے نہ آخرت میں ان کی دشمنی کا کچھ  
نقصان۔ بلکہ ان چیزوں کا تو آخرت میں کوئی دھوکہ ہی نہ ہوگا۔ اب صرف فوت شدہ بزرگ  
ہی رہ جاتے ہیں۔ جو اس آیت کا صحیح مصداق بن سکتے ہیں۔

(۲) احادیث صحیحہ | احادیث صحیحہ کے متن کے طور پر چار باتیں ملنے آتی ہیں  
۱۔ نبی اکرمؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجا۔

۲۔ تلبیس بذر کا واقعہ۔

۳۔ مرنے کا تدفین کے بعد واپس جانے والوں کے قدموں کی چاپ گھٹنا۔ اور  
۴۔ قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو اسلام علیکم دار قوم مؤمنین وغیرہ کہنے کا ارشاد نبویؐ۔ ان باتوں  
میں سماع موثق کا احتمال موجود ہے۔ گویا احادیث صحیحہ چونکہ قائلین اور منکرین سماع کے  
درمیان مشترک ہیں۔ لہذا ان کا ذکر ہم منکرین سماع موثق کے دلائل میں پیش کریں گے۔

(۳) تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث | ایسی احادیث میں سماع موثق کا ثبوت بلحاظ  
ہے۔ اور یہی احادیث دلائل سماع موثق

کے قائلین کے لیے رکن شہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ احادیث تیسرے اور چوتھے  
درجہ کی ہیں، جو قابل احتجاج نہیں ہوتیں۔ حقائق سے کوئی حکم نہ ہو سکتا ہے۔ لہذا ان پر مبرہ  
کرنا بیکار اور خارج از بحث ہے۔ اس طرح کی ایک دو احادیث کا ذکر آئندہ مل کر آئے گا۔ جو  
ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود بہت مشہور ہیں۔

(۴) بزرگوں کے اقوال | بزرگوں کے اقوال نے تو سماع موثق کی بنیاد پر ایک قہر عظیم تیار  
کر دیا ہے۔ یہ بزرگ مڑوں کو یوں زندہ کرتے ہیں کہ حضرت

عینی کا معجزہ ان کی کرامات کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم بتلا چکے ہیں کہ مڑوں کو زندہ  
کرنے کا امکان ہے مگر ان حضرات نے تو اس امکان کو اتنا عام کیا کہ عام منابط اور استثنائیں  
کوئی فرق ہی نہ چھوڑا۔ مولانا مودودی صاحبؒ نے کہا تھا کہ مسلمان کی عادت سی بن گئی ہے کہ  
جہاں انھیں سنی کے ناکر جتنی گنجائش ملی وہاں سے وہ ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی  
صورت حال ان لوگوں کی بھی ہے۔ سماع موثق، حاجت برآری اور تعقیبات امور میں ان کا  
دعویٰ اللہ تعالیٰ سے کسی صورت کم تر نہیں ہوتا۔ اگرچہ زبان سے وہ یہی کہتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت  
کے متبع ہیں۔ یہ مباحث اس موقع پر خارج از بحث ہیں۔ سیر و ست ہم یہی عرض کرنا چاہتے  
ہیں کہ بزرگوں کے ان اقوال اور خوابوں کو ان کے بعض معتقدین بھی محنت نہیں سمجھتے۔ تو ان کو  
زیر بحث لانا بالکل بیکار ہے۔

## منکرین سماع موثق اور ان کے دلائل

۱۔ قرآن | قرآن میں مذکورہ بالا تین آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے  
ملہ ان کا ذکر ہم نے اپنی تصنیف ”اثر مذہب و طریقت“ میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے جو زیر طبع ہے۔

سماحِ موتی کا رد ثابت ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم توں کہیں گے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مرحلہ مسیح  
یعنی برزخی زندگی میں مُردوں کے متعلق عام ضابطہ الہی یہی ہے کہ وہ سن نہیں سکتے۔ اس طرح کی مزید  
آیات کا اندراج طوالت کا باعث ہوگا۔ مقصد برآری کے لیے یہی تین آیات کافی ہیں، جو  
دفعہ کی حاجتی ہیں۔

## ۲۔ احادیث صحیحہ

(۱) مقتولین پر | تلمیح بہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقتولین پر کے خطاب  
کا واقعہ تقریباً تمام کتب صحاح میں موجود ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف یہ  
بخاری سے تین روایات نقل کریں گے (ایک حدیث کے راوی عبداللہ بن عمر ہیں۔ دوسری کے  
حضرت قتادہ اور تیسری کی حضرت عائشہؓ) تاکہ معاملہ کے سب پہلو سامنے آجائیں۔ امام بخاریؒ  
نے یہ احادیث کتاب المغازی (غزوہ بدر) میں درج فرمائی ہیں اور کتاب الجنازہ باب ما جاز  
فی مذاب القبر میں بھی۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

”لَا ظَلَمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أَهْلِ الْقُبُورِ فَقَالَ وَجَدْتُهُمْ  
تَمَازَعَدُ كُهُرَهُمْ كُهُفًا ۖ فَقِيلَ لَهُ أَتَدْعُو أَمْوَاتًا ۖ قَالَ: مَا أَنْتُمْ بِمَعْمُومِي  
مِنْهُمْ وَلَكِنْ لَا يُجِيبُونَ“

”جو کافر بدر کے دن اندھے کنویں میں ڈال دیئے گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ  
تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر جہان نکا اور فرمایا۔ ”تمھارے مالک نے جو تپا وعدہ تم  
کے کیا تھا وہ تم نے پایا؟ لوگوں نے عرض کیا: ”آپ مُردوں کو پکارتے ہیں؟“  
فرمایا ”تم کچھ اُن سے زیادہ نہیں سنئے۔ البتہ وہ جواب نہیں دے سکتے۔“

(ب) حضرت قتادہؓ انسؓ اور وہ ابو طلحہ انصاریؓ سے یہی واقعہ روایت کرنے کے بعد  
کہتے ہیں۔

”قَالَ قَتَادَةُ: أَخْبَاهُمُ اللَّهُ حَتَّى أَسْمَعَهُمْ قَوْلَهُ كَوْنِيهَا وَتَصْفِيهَا  
وَرَفْعَتَهُ وَخَسْرَتَهُ وَنَدَامًا“ (بخاری کتاب المغازی، ابواب غزوہ بدر)  
”قتادہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ کہا کہ اللہ نے اُس وقت اُن مُردوں کو جلا دیا



تھا، اُن کو درجہ توبیخ کرنے، ذیل کرنے، بدلہ لینے، انہیں دلائے اور شرمندہ کرنے کے لیے :

(ج) حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم یا اس اجتہاد کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ عبداللہ مہول گئے۔ (نسائی۔ کتاب البنائز۔ باب غذاب القبر)  
اور خود اس واقعہ کے متعلق فرمایا :

”قَالَتْ اِكْمَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللَّهُمَّ لَيَعْلَمَنَّ اَنَّ مَا كُنْتُ اَقُولُ لَكَوَحَقٍّ وَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالٰى اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى“ (بخاری۔ کتاب البنائز۔ باب ماجاء فی غذاب القبر)

”حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے کافروں کو صرف یہ کہا تھا کہ : میں جو ان سے کہا کرتا تھا اب ان کو معلوم ہو گا کہ وہ سچ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ نوح میں فرمایا کہ اے پیغمبرؐ تو مردوں کو سنا نہیں سکتا؟ ان ہر سہ امارت سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سماعِ موتی کے قائل تھے۔ گو انہوں نے بھی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے۔ تاہم اُن کا یہ عمل تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے حجرہ کے باہر کھڑے ہو کر رسول اللہؐ پر، حضرت ابوبکرؓ پر اور اپنے باپ حضرت عمرؓ پر سلام کہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سماعِ موتی کے قائل تھے۔

۲۔ گو آپؐ سماعِ موتی کو درست سمجھتے تھے، تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے، گویا اُن کے نزدیک بھی یہ سلام، سلامِ دُعا یا ”سلامتی کی دعا“ تھا، سلامِ تحیۃ نہ تھا، جس کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

۳۔ حضرت قتادہؓ اس واقعہ کو نبی اکرمؐ کا معجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کافروں کی زجر و توبیخ اور حسرت و ندامت دلانے کے لیے کہے۔ تو اللہؐ نے اُن کی دُعا میں توفادیں، تاکہ وہ یہ الفاظ سُن لیں۔ یا اللہؐ نے بدلہ راست اُن کی دُعا تک یہ الفاظ پہنچا دیئے۔

۴۔ حضرت عائشہؓ سماعِ موتی کی اس حد تک انکاری ہیں کہ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس فہم کا رد بھی کیا۔ آپؐ بھی اس واقعہ کو ایک معجزہ قرار دیتی ہیں۔ اُن کے خیال میں

ان مژدوں کو سنا دینا اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی توجیہ وہی بیان فرمائی جو حضرت قتادہ نے فرمائی۔

اب دیکھئے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک مجتہد گزرا، زاہد، متقی  
**حضرت عائشہؓ کا تفقہ** اور صالح انسان مژدہ تھے۔ مگر تفقہ میں انھیں وہ مقام حاصل  
 دے گا جو حضرت عائشہؓ کو حاصل تھا۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے میل القدر صحابہؓ مسائل  
 دریافت کرنے آتے تھے۔ حرمی کی درج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے:

”عَنْ أَبِي مُؤَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: مَا اشْتَكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ  
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ إِلَّا  
 وَحَدَّثَنَا بِهَا مِنْهُ عِلْمًا“ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب مناقبہ زلفہ النبیؐ)  
 ”ابو موسیٰ اشعرشی سے روایت ہے کہ جب بھی ہم اصحاب رسول اللہ میں کسی حدیث  
 کے متعلق اشکال پیدا ہوتا تو ہم اُسے حضرت عائشہؓ سے مل کر لے کر آتے تو ہمیشہ  
 آپ کے پاس اس حدیث کا علم پایا کرتے۔“

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تفقہ کا یہ حال تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے ان کے بارے  
 میں غلیظہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:-

”وَاللَّهِ مَا أَرَدْتُ بِهَذَا، وَبِحَاكِ كَيْفَ أَسْتَخْلِفُ دَجَلًا عَجِزَ عَنْ  
 طَلَاقِ امْرَأَتِهِ“ (بخاری، ترمذی، ابوالحارث)

”خدا کی قسم! میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں ہے۔ تجھ پر افسوس! کیا میں ایسے  
 شخص کو اپنا جانشین بنا جاؤں، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طریقہ بھی  
 نہیں آتا۔“

اس تقابل سے نعوذ باللہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شان کو کم کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ آپؓ  
 کو خود رسول اللہ نے سماج آدمی کہا اور مجتہد پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ ان کی یہ فضیلت اپنے  
 مقام پر ہے لیکن جہاں تک قوتِ اجتہاد کا تعلق ہے، حضرت عائشہؓ کا مقام ان سے بہت  
 بلند تھا۔

گویا حضرت عائشہؓ کے اجتہاد کے مطابق رسول اللہ کے یہ کلمات زجر و توہین اور حسرت و

افسوس دلانے کے طور پر کہے۔ جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دنیا میں تیرنے سے منع کرتا ہے۔ مگر بیٹا اس کام سے باز نہ آئے اور دنیا میں ڈوب کر مر جاتے۔ پھر اس کی لاش باپ کے سامنے آئے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ میں نے تجھے نہ کہا تھا کہ یہ کام نہ کرنا در نہ مرنا ہو گا۔ گویا یہ کلمات زجر و توبیخ کے طور پر رسول اللہ نے کہے اور اعجاز کے طور پر اللہ نے یہ کلمات ان مقتولین بدر کو سنوا دیئے۔

۲۔ اہل قبور کو السلام علیکم کہنا | احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ”مسلمان جب قبرستان ہائیں تو“ اَللّٰهُمَّ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْقُبُورِ یَا اَسْلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ کُنُومُ مَوْتِیْنَ“ کہیں۔ یہی وہ دلیل ہے جو ساری موتی کے قائلین کی طرف سے بڑے فتوے پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ کسی خاص واقعہ سے بھی متعلق نہیں۔ ساری موتی کا انکار کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ یہ سلام، سلامتی کی دعا ہے، سلام تحیہ ہے ہی نہیں جو سنا جاسکتا ہو اور جس کا جواب دینا فرض ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت عائشہؓ کا بھی یہی موقف تھا۔ اس کی مثال بھی یوں ہی کہئے جیسے تشہد میں رسول اللہؐ پر سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا کوئی خط لکھنے والا ابتداء میں السلام علیکم سے خطاب کرتا ہے۔ اس سلام کا فوری جواب دینا تو درکنار جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ کوئی جواب آہٹا ہے کبھی نہیں آتا۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب رسول اللہؐ پہنچا ہوا سلام بھی انھیں خود نہیں سنتے بلکہ فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام مسلمانوں پر بھیجا ہوا سلام ان خود ان تک پہنچ جائے اور وہ اسے سن سکیں۔ ایسے سلام بھی بذریعہ خدا تعالیٰ ہی ان تک پہنچتے ہیں۔

۳۔ جو قوتوں کی چاپ | دوسرا واقعہ جس سے ساری موتی کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب میت کو اس کے عزیز و اقارب دفن کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو مردہ ان کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے؟

یہ واقعہ بھی چونکہ محدث صحاح میں موجود ہے۔ امام بخاری نے اسے کتاب الجنائز باب ما جاز فی عذاب القبر میں دو مقامات پر اس طرح درج فرمایا ہے:

”اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِذَا مَاتَ عَبْدٌ وَوُضِعَ فِي قَبْرِہٖ کُوْنُوْیْ عَنْہُ اَصْحَابُہٗ اِشْدَیْ لِمَعْمُکُمْ کَرَمَ فِعْلِہٖ اِنَّا اَمَلَاکَانَ فَيَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ یَقُوْلُوْنَ ... (الحديث)

”رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی شخص مرتا ہے اور اپنی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اُسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں تو وہ اُن کے جوتوں کی چاپ سنتا ہے۔ اس وقت اُس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے بخلا دیتے ہیں پھر کہتے ہیں:..... (الحديث)

اب مشکل یہ ہے کہ مردہ کے جوتوں کی چاپ سننے کا واقعہ بخاری کے علاوہ دوسری کتب صحاح میں جہاں بھی مذکور ہے تو ساتھ ہی منکر کبیر کے آنے اور سوال و جواب کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ گویا منکر کبیر کے آنے سے بخود ہی دیر پہلے اُس کی روح عقیقین یا ستمین سے ٹوٹا کر اُسے ہوش میں لایا جاتا ہے، تاکہ وہ سوالوں کے جواب دے سکے۔ اب یہ سوال و جواب کا واقعہ تو ایک اضطرابی امر ہے اور خاص اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پھر کبھی حدیث میں یہ بھی مذکور نہیں کہ وہ ان اصحاب کی باتیں بھی سنتا ہے تو اس خاص واقعہ سے علی الاطلاق سماع موتی کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

اور دوسری مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ سے بھی حسرت و انوس کا احساس دلانے کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی جب عزیز و اقارب میت کو دفن کے کھدے پہلے جاتے ہیں، تو اُسے یہ احساس لایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے تُو مارا مارا پھرتا تھا، حتیٰ کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ دیکھ وہ اب تجھے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہذا اُسے صرف جلتے والوں کی آہٹ تو سنا دی جاتی ہے، آنے والوں کی نہیں۔ اور نہ ہی قبر پر موجود لوگوں کی گفتگو اُسے سنائی جاتی ہے نہ ہی وہ سن سکتا ہے۔

۴۔ حضور اکرم پر صلوٰۃ و سلام (۱) لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُورًا وَلَا تَجْعَلُوا قُبُورِي عِيْدًا اَوْ صَلَواتًا عَلٰی فَاِنَّ صَلَواتَكُمْ تُبْكَتُنِي حَيْثُ كُنْتُ ۝

”اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی اُن میں نفل و زناغل پڑھا کرو) اور میری قبر کو جشنِ اجتماع نہ بناؤ اور مجھ پر دُود پڑھا کرو۔ کیونکہ تمھارا دُود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے جہاں کہیں تم ہو (یعنی قبر کے نزدیک ہو یا دُور)۔

اور سنائی میں اس دُود کو پہنچانے کی تفصیل توں بیان کی گئی کہ:

(۲) اِنَّ رَبِّيْ مَلِيْكَهٖ سَيَا حَيِّنُ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنِيْ مِنْ اَمَّتِي الْاَسْلَامُ ۝

”اللہ تعالیٰ نے رُوحے زمین پر سیل فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو میری امت کا سلام بھی تک پہنچاتے ہیں؟“

اسی طرح دوسری کتب احادیث میں بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ جو باوجود اختلاف الفاظ کے اس مضمون میں مشترک ہیں کہ امت کا مصلوٰۃ و سلام فرشتوں کے ذریعہ بھی اکرم تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ چاہے کہیں سے بھی پڑھا جائے :

یہ سب احادیث سماعی و روایتی تو درکنار اس کا خلاف ثابت کر رہی ہیں۔  
 علاوہ انہیں ایک روایت مشکوٰۃ (کتاب الفضلۃ علی النبی بعد التشہد فصل ثانی بحوالہ المعانی) اور بیہقی فی الدعوات الکبیر یوں بھی آئی ہے :

۱۔ مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللَّهُ عَلَيَّ رُوحِي حَتَّىٰ أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ :  
 ”جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے، اللہ میری رُوح مجھ پر لوٹا دیتا ہے حتیٰ کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں؟“

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :  
 ۱۔ رسول اللہؐ اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے)۔ آپؐ کی رُوح اعلیٰ عقیقین میں ہے، جہاں سے وہ سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے۔  
 اگر آپؐ قبر میں زندہ ہوں تو رُوح کے لوٹنے جانے کا کچھ مطلب نہیں چلتا۔  
 ۲۔ رُوح سلام کا جواب دینے کے لیے لوٹائی جاتی ہے سلام سننے کے لیے نہیں۔ کیونکہ مدبر بالا احادیث کی رُوح سے سلام تو آپؐ کو فرشتوں کے ذریعہ پہنچا ہی دیا جاتا ہے۔ آپؐ ان جمع شدہ سلاموں کا جواب اس صورت میں دیتے ہیں کہ آپؐ کی رُوح قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اور آپؐ جواب دیتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ اور عام افراد امت میں فرق یہ ہے کہ انبیاءؑ کے جسم مٹی پر حرام قرار دے گئے ہیں اور یہ بات خاص انبیاءؑ میں سے ہے۔ پھر جب آپؐ پر سلام و جواب کی یہ صورت ہو تو دوسروں پر اگر سلام پڑھا یا عمار کی جاسے تو ان کا سُنا اور جواب دینا نامکن نظر آتا ہے۔ علی الاطلاق سماعی و روایتی کا قبول کرنا پھر بھی محال ہے۔

اب رُوح سلام جو نماز میں تشہد کے بعد ان پڑھا جاتا ہے تو یہ سلام خطاب یا سلام تشہد | سلام تحیہ ہے ہی نہیں۔ نہ ایسے سلام کو حضورؐ نے سُنا، نہ کہیں اس کا جواب دیا۔

نہ نماز میں نہ نماز کے بعد۔ حتیٰ کہ جب مخاطب سیکھنے کی غرض سے اونچی آواز سے یہ سلام رسول اللہ کے سامنے پڑھتے یا "السلام علیک ایتہا النبی" کہتے تھے۔ جب بھی آپ نے اس کا کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہ سلام بطور حکایت پڑھا جاتا ہے اگرچہ اس میں مخاطب رسول اللہ کی فائز ہے۔ واقعہ معراج کے دوران اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "السلام علیک ایتہا النبی" اور اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: "السلام علیک اوعلیٰ عبد اللہ الصالحین" تو یہ کلمہ بعینہ نماز میں بطور مکرم پڑھا جاتا ہے۔ یہ سلام دُعا کے طور پر ہے جس کا سننے سناتے یا جواب دینے سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے علاوہ بیہقی فی شعب الایمان میں ایک روایت یوں بھی آئی  
**موضوع احادیث** ہے۔ جو عوام میں مشہور ہے، نیز یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب القلۃ، باب

الصلوة علی النبی فصل ثلث میں بھی درج ہے:

مَنْ صَلَّى عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهُ ۖ

"جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر سلام پڑھے تو میں اس سلام کو سن لیتا ہوں۔"  
 یہ روایت موضوع یا من گھڑت ہے۔ اس کا راوی محمد بن مروان السدزی کذاب اور ضلع ہے۔ جس کا کام ہی جھوٹی حدیثیں گھڑنا تھا۔ امام بیہقی نے اسی وضاع سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جو اس روایت کی خود ہی تردید کرتی ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

مَا مِنْ عَبْدٍ يُسَلِّیْ عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ إِلَّا وَكَلَّ اللَّهُ بِهِ مَلَكًا یَبْلُغُنِیْ ۖ

"جب بھی کوئی شخص میری قبر کے پاس کھڑے ہو کر مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ

ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس سلام کو میرے پاس پہنچا دیتا ہے۔"

گویا اصل ما بہ النزاع مسئلہ کا اس وضاع نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ اس کی دوسری حدیث بخیر دوسری صصح احادیث کے مطابق ہے لہذا فرماں ہوئی اِنَّ الْکَذِبَ قُبْ کَذِ یَصْدُقُ کے مطابق اسے صحیح قرار دیا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام خواہ قبر پر پڑھا جائے یا دُور سے۔ آپ کو فرشتوں ہی کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔

فاضح رہے کہ:

**نقد و نظر** (۱) مصیبن کی احادیث اقل درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ باقی صحاح کی چار کتابوں کی احادیث دوم درجہ کی اور باقی کتب احادیث کی روایات علی قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی اکثر احادیث ناقابل اعتماد ہیں۔

۲۔ مشکوٰۃ حدیث کی مستقل کتاب نہیں۔ بلکہ مختلف کتبِ امارت سے منتخب مجموعہ ہے۔ اس کی تدوین پہلے امام حسین بن سعید البغوی نے ۳۵۰ھ میں کی۔ اور اس کا نام مصابیح السنۃ جوینہ کیا۔ اس میں ہر باب کی دو تفصیلات رکھیں پہلی فصل میں مصیبت کی امارت درج کریں۔ اور دوسری میں باقی چار مصابیح کی کتابوں کی۔ پھر امام محمد بن عبداللہ الخطیب نے آٹھویں صدی میں اس کو از سر نو مدقن کیا۔ اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ اور اس میں ہر باب کے بعد ایک تیسری فصل کا اضافہ کیا۔ اور اس میں بلا امتیاز جو حدیث ملی، درج کر دی۔ خواہ یہ درجہ اول یا دوم سے تعلق رکھتی ہو اور پہلے درج نہ ہوئی۔ اور خواہ یہ حدیث درجہ سوم اور چہارم سے تعلق رکھتی ہو۔

۳۔ حدیث ۱۲ (رَدُّ الشُّكْلِ رَجْعِي) میں یہ بھی کہے گئے ہیں کہ ابو داؤد کا حوالہ بھی آگیا ہے۔ لہذا یہ تفصیل ثانی میں درج کر دی گئی اور موضوع حدیث ۱۷ کا فصل ثالث میں اندراج بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ناقابلِ اعتماد ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ المصابیح کی عربی شرح مرآۃ المفاتیح مولانا عبید اللہ رحمانی نے لکھی ہے۔ انھوں نے حدیث ۹۳ (یعنی ہماری مندرجہ حدیث ۱۲) پر جو حواشی لکھے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے۔ (مرآۃ المفاتیح جز ثانی مطبوعہ مکتبۃ اشریہ ساکنہ دہلی ۱۳۵۵ھ، صفحہ ۱۲۵)۔

۵۔ اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ سلام نزدیک دُعا یا دُنیا کے کسی جمعہ سے آپ پوچھا جائے وہ تمام صحیح اور مشہور امارت کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔

۶۔ میرے (شایع کے) خیال میں رابع بات یہ ہے کہ یہ سلام ہمارا ہے سلامِ نجاتیہ نہیں۔  
۷۔ اس حدیث (سَمِعْتُ) "والی کا سند یوں ہے۔ العلاء بن عمرو۔ محمد بن مروان السدی۔ اعمش۔ ابی صالح۔ ابی ہریرہ مرفوعاً۔  
فقہی کہتے ہیں کہ:

۱۔ اعمش والی حدیث کا کچھ اصل نہیں۔

۲۔ العلاء بن عمرو کے تعلق ابنِ حبان اور لازدی نے کہا کہ یہ ناقابلِ اعتماد ہے۔ اور

۳۔ محمد بن مروان السدی متروک الحدیث اور متہم بالکذب ہے۔

موضوع حدیث ۱۲ | ابنِ عبداللہ نے الاستدکار و التہدید میں ابنِ عباس سے

روایت کیا کہ:

”مَامِنْ أَحَدٍ قِيَمْتُ بِقَبْرِ أَخِيهِ السُّوْمِيِّ كَانَ يَعْرِفُهُ فِي الدُّنْيَا قِيَمْتُ لَهُ عَلَيْهِ  
الْأَعْرَافَ وَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ“

”کوئی بھی شخص جو اپنے مومن بھائی کی قبر پر گوردہ ملے جسے وہ دنیا میں پہچانتا تھا۔ جب  
یہ گوردہ والا شخص اس کو سلام کہتا ہے تو وہ اسے پہچان لیتا ہے اور وہ سلام کا جواب  
دیتا ہے“

اور اسی مضمون سے معنی جلتی حدیث ابن ابی الدنیاء نے زید بن اسلم سے۔ ابو ہریرہ سے  
کتاب القبور میں یوں بیان کی:

”إِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرِ أَخِيهِ قَسَمَ لَهُ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَعَرَفَهُ  
وَإِذَا مَرَّ بِقَبْرِ أَخِيهِ قَسَمَ لَهُ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ“

(مرقاۃ المفاتیح - ج ۲ - ص ۵۵ سے نقل کی گئی)

**علمائے دین اور سماع موٹی** | اس حدیث کے متعلق مستفسر جناب عبدالقادر سمرودی  
نے استفسار فرمایا۔ یہ حدیث امام ابن قیمیہ نے کتاب  
الوسیلة (مترجم ص ۳۳) میں درج فرمائی۔ اور امام ابن قیمیہ نے اپنی کتاب کتاب الرواح کچھ پہلے باب  
میں ابن ابی الدنیاء کی کتاب القبور کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ کتاب الرواح ترجمہ از محمد اؤد  
راغب رحمانی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ص ۲۱) اس حدیث کے مرئود ہونے کے لیے یہی بات  
کافی ہے کہ اس کتاب کے مترجم ابو داؤد راغب رحمانی نے اسی کتاب کے مندرجہ ذیل باب  
کے تحت یہ مراحف فرمادی کہ ”ابن ابی الدنیاء کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں“ لطف  
بات ہے کہ ایک صفحہ پر مترجم یہ مرئود بات لکھتے ہیں۔ اور سلسلے صفحہ پڑھی ابن ابی الدنیاء کی  
یہ روایت نقل جاتی ہے۔ جس سے امام ابن قیمیہ نے احتجاج کیا ہے۔

مستفسر جناب محمد احسان الحق صاحب نے یہ سوال بھی (سوال ۵) کیا تھا کہ کتاب الرواح  
لابن قیمیہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ امام ابن قیمیہ اور ان کے استاد جناب  
امام ابن قیمیہ دونوں بزرگ نہ صرف یہ کہ سماع موٹی کے قائل تھے بلکہ اسی طبقہ صوفیہ سے تعلق  
رکھتے تھے۔ جنہوں نے اس مسئلہ کو اچھا لا اور ضعیف اور موقوفہ اعمادیت کا سہارا لے کر اس  
مسئلہ کو علی الاطلاق ثابت کرنا پایا ہے۔ امام ابن قیمیہ اور امام قیہ دونوں صاحب کشف و کلمات



بھی تھے۔ اور دونوں بزرگوں نے نصوت و سلوک پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اور یہ قواپ جانتے ہی ہیں کہ اگر اس طبع کے منہ سے قبر اور سماع موتی کے مسئلہ کو کھینچ لیا جائے تو ان کے پاس باقی رہ گیا جاتا ہے؟

اسی طرح کے ایک تیسرے بزرگ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔ یہ تینوں بزرگ جب شرک و بدعات کی تردید پر قلم اٹھاتے ہیں، تو جی عیش عیش کراٹھتا ہے۔ اور ہم دل و جان سے اُن کی دینی خدمات کے معترف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ زیادات قبور کے آداب اور کشف کے طریق بتلاتے ہیں تو نہیں سوچتے کہ آیا قبروں اور مزارات کے وجود کا بھی کوئی ہوا ہے یا نہیں یا قبروں پر اس غرض سے بیٹھنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ مَرَدوں کو شانا اور اُن سے سُنانا تو دُور کی باتیں ہیں۔ ان سب باتوں کی کتاب وسنت نے پُر زور تردید کر دی ہے۔

یہ تو غیر مستفسرین کے سوالوں کے جواب تھے۔ اب زیر بحث حدیث کی طرف آئیے۔ جو کہتی ہے کہ مَرَد اگر سلام کہنے والے کو پہچانتا ہے۔ تو جواباً اس پر سلام بھی کہتا ہے۔ اور اگر نہیں پہچانتا تو میرٹ اسے ٹوٹا دیتا ہے۔ اور ایسی طرح بعض دوسری روایتوں میں بھی ہے کہ مَرَد اپنے واقف کے آنے سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے بار بار آنے سے مہلنے سے مانوس ہو جاتا ہے۔

اب ایسی اُمادِ شیعہ سے صحتِ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

**جملی حدیث کے نتائج** | (۱) قبرستان میں ہر طرف مَرَد ہی نہیں بلکہ مَرَد میں بھی ہر وقت موجود

رہتی ہیں اور وہ ان کے بدوں میں ہوتی ہیں (عین یا عین میں نہیں ہوتیں)۔

(۲) ان مَرَدوں میں شعور بھی ہوتا ہے اور شعور کا تعلق مَدَح سے ہے بدن سے نہیں۔ اس سے

معلوم ہوا کہ مَرَدوں کے اجسام میں شعور موجود ہوتی ہیں۔ یعنی وہ قبور میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۳) وہ سلام و غیرہ سنتے ہی نہیں بلکہ اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سوال و جواب قبر

پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ثبات ہوتا ہے کہ قبور میں مَرَد سے نہیں بلکہ زندہ اور باشعور

انسان تشریف رکھتے ہیں۔

اور یہ وہ بنیاد ہے جس کی بنیاد صوفیاء کو ضرورت تھی۔ لیکن قرآن ان کی ایک ایک بات

کی پُر زور تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ زورِ موت کا دور ہے زندگی کا نہیں۔ قبور میں پڑے

توڑے لوگ مَرَد ہیں، نہ اُن میں شعور ہے، نہ یہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں۔ آپ دیکھ

ہستے ہیں۔ یا تو ان اماموں اور بزرگوں کی روایات اور اقوال اور کاشفات کو مان لیجئے اور قرآن و متنبوار ہو جائیے۔ ورنہ ان سب خرافات سے دستبردار ہونا پڑے گا۔  
 اللہ تعالیٰ نے جو استثنائی قصود بیان فرمائے کہ ”اگر چاہے تو عمرودوں کو سنا سکتا ہے“  
 اس مستفاد سے اس قدر گنجائش نکالنا کہ قرآنی تعلیمات کے باطل پر مبنی ہو جائے۔ آخر کہاں تک  
 گورا کیا جا سکتا ہے؟

**کتاب المزج اور سماع موثق** | اس کتاب کا آغاز سماع موثق پر بحث سے ہوتا ہے۔ لیکن تین  
 کی کوئی آیت درج نہیں۔ آغاز کتاب ابن عبد البر کی اس حدیث  
 سے ہوتا ہے جسے ہم نے موضوع حدیث کے تحت درج کیا ہے۔ اس کے بعد قلیب بدوای  
 حدیث درج مندر ہے۔ لیکن اس پر حضرت قتادہ یا حضرت عائشہ کا جھوٹا دیا گیا ہے۔ بعد  
 از ان ”السلام علیکم ذاکم مؤثر منین“ کی روایت درج ہے۔ اور پھر ابن ابی الدنیا کی  
 روایات مذکور ہیں۔ جس کے متعلق کتاب الترمذی کے مترجم محمد داؤد رافعی نے پہلے ہی مطلع  
 کر چکے ہیں کہ ابن ابی الدنیا کی روایتیں بلا تحقیق کے ناقابل قبول ہیں۔ یہ پانچ روایات درج  
 کرنے کے بعد بزرگوں کے اقوال اور خوابوں کے واقعات کا لاغناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس  
 سے آپ خود ہی اندازہ فرمایئے کہ کتاب و سنت کے معیار پر یہ کس قدر تحقیقی کتاب کہلائے جانے  
 کی مستحق ہے۔

**امام ابو حنیفہ** | حیرت کی بات ہے کہ سماع موثق اور اسی طرح سلوک و تصوف خفیوں کا  
 نام (مخصوص بریلوی طبقہ) میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہ سماع  
 موثق کے سنت مخالف تھے۔ آپ کے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے کسی شخص کو ایک قبر پر  
 صاحب قبر کو کھاتے دیکھا تو کہنے لگے:

”تمہ پر پھکار ہو اور تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں، تو ایسے اجداد سے بات کرنا

بے جود آواز سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ اختیار رکھتے ہیں؟

پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: ”وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ“

بائیں ہمہ سماع موثق کی بنیاد پر پھیلنے والے دوسرے شرکیہ عقائد کی سرپرستی کا حق جس

قدر فرقہ بریلویہ نے ادا کیا ہے کسی نے کم ہی کیا ہو گا۔ دوسرے نمبر پر دیوبندی حضرات ہیں اور

ہمیں انہوں سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میدان میں پیچھے نہیں رہے۔ جتنے ردی انھوں نے بھی

**علامہ وحید الزمان** | متاقرین میں ایک عالم شخصیت علامہ وحید الزمان ہیں۔ یہ پہلے شیعہ تھے، پھر حنفی ہوئے۔ پھر اہلحدیث ہوئے۔ تاہم کچھ نہ کچھ سابقہ اثرات جمیعت میں باقی رہ ہی گئے۔ مثلاً آپ اہلحدیث تک نفی صلیت علیہ کے قائل ہیں۔ اور جہاں کہیں یزید کا نام آیا تو یزید پر طید لکھا۔ آپ جب حنفی تھے تو سماع موثق کے قائل تھے۔ اہلحدیث ہوئے تو بھی قائل ہی رہے۔ پھر اس سماع موثق کے مسئلہ میں آپ کو امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے تائید بھی مل گئی۔ تو اس سماع موثق کے جواز کا خوب پرچار کیا۔ آپ نے قرآن کی تفسیر موضع القرآن بھی لکھی۔ صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ لغات الحدیث بھی لکھی۔ تو جہاں کہیں آپ کو اس مسئلہ کو زیر بحث لانے کا موقع ملتا رہا آپ اسی طرح کا انداز اختیار کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم کتاب ارجوح کے حصے سے متعلق پیش کر چکے ہیں۔ ہم یہاں لغات الحدیث سے سماع موثق کے متعلق آپ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مسئلہ میں آپ کا طرز استدلال کس قدر صلی اور جانبدارانہ نہیں ہے۔ سمعہ کے تحت فرماتے ہیں:

”اِنَّكَ لَا تُنْجِعُ الْمَوْتٰی“

”تو مردوں کو (یعنی کافروں کو) اسلام نہیں قبول کروا سکتا۔“

اس آیت سے سماع موثق کی نفی نہیں نکلتی۔ جیسے حضرت عائشہؓ نے خیال کیا، کیونکہ سماع سے یہاں سماع اجابت مراد ہے۔ جیسے اسمع غیو مسامع میں۔ اور متفقہ امداد شیعہ سے سماع موثق ثابت ہے جیسے اوپر گزر چکا۔ اور اہل حدیث کے بڑے بڑے امام جیسے ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اسی کے قائل ہیں۔ صرف خفیہ اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا۔ مجمع البحار میں ہے کہ ”اِنَّكَ لَا تُنْجِعُ الْمَوْتٰی“ کا معنی یہ ہے کہ قرآن جاہلوں کو نہیں سمجھا جاسکتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل بنا دیا ہے۔

(لغات الحدیث، ردیف ص ۱۳۳)

اس اقتباس پر تبصرہ کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ کیونکہ علامہ صاحب کے ان دلائل کے متعلق ہم پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

۱۰ جب ترجمہ ہی بدل دیا تو نفی نکل بھی کیسے سکتی ہے؟ پھر ترجمہ بدل دینے کے بعد اسیرؒ سماع موثق کا ذکر ویسے ہی کھکتا ہے۔

اللہ کا نکر ہے کہ اہم حدیث مذکورہ کا مفقود ہے اور یہ عقائد کا وہ ان بزرگوں سے استفادہ  
 کر سکتا ہے مگر روشنی براہ راست کتاب و سنت سے حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو  
 اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

## سماع موتی اور مولانا مودودی مرحوم

مولانا مرحوم نے سورۃ احقاف کی آیات ۳۵-۳۶ (جو ہم آیت ۳۵ کے تحت مدح کر چکے ہیں)  
 کے تحت بڑا جامع اور بصیرت افروز حاشیہ لکھا ہے جس میں قرآنی آیات کا صحیح مفہوم،  
 کی صورت، صحیح احادیث کا لپٹ باب سب کچھ آجاتا ہے۔ اور اکثر اشکال بھی دور ہو جاتے ہیں۔  
 ان کا یہ بیان مدح ذیل ہے :

”یعنی ان پکائے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں  
 سے سن سکتے ہیں، نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انھیں  
 کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشاد الہی کو تفصیلاً توں سمجھنے کو دنیا بھر کے مشرکین خدا کے  
 ”ہوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں۔ وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک  
 بے رُوح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گنہگار ہیں۔ تیسرے وہ  
 گمراہ انسان جو خود بھی گمراہ ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دنیا سے نصرت  
 ہوئے پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے مابعد کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر  
 ہی ہے۔ دوسری قسم کے معبود، جو اللہ کے مقرب بندے تھے تو ان کے غیر  
 رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں، جہاں انسانی  
 آواز برآہ راست ان تک نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے دشمن  
 بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو بزرگ ساری عمر اللہ سے  
 دُعا مانگنا سکھاتے رہے تھے۔ وہ اب انہی آپ (اس بزرگ) سے دعا مانگنا تک  
 دہے ہیں۔ اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو مندرجہ پہنچانے والی کوئی چیز  
 نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند  
 نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے  
 بھی بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مومنوں کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی

وَلَا رَحْمِينَ ہوں بندہ میں جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اُس کے فرشتے بھی انھیں یہ اطلاع نہیں پہنچانے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے۔ اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ یہ خبریں اُن کے لیے مسرت کا موجب ہوں گی اور خدا اُن کو ہرگز غمش کرنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعاؤں سے رحمتِ ربیہ قبر پر یا نماز میں پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے فرحت کا موجب ہیں۔

اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور بھٹکا سا درد زبرد تو بیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگِ بدر میں اہلِ بدر نے وائے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبخ سنوا دی تھی۔ کیونکہ اُن کے لیے یہ اذیت کا موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کا موجب یا مجرمین کے لیے فرحت کا موجب ہو، اُن تک نہیں پہنچاتی جاتی۔ اس تشریح سے سماعِ موتی کے مسئلے کی حقیقت، بخوبی واضح ہو جاتی ہے؟

**مسئلہ سماعِ موتی کی پشت پناہی** | مندرجہ بالا تصریحات سے یہ قیصر نکالنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ قرآن اس مسئلہ کی پر زور تردید کرتا ہے۔ احادیثِ صحیحہ کے سلسلے رکھ کر اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جاتے تو بھی حضرت عائشہؓ کے دلائل راجح معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعد کے ادوار میں اُمت کے ایک بڑے طبقہ نے سماعِ موتی کے مسئلہ کو درست سمجھا۔ یہ طبقہ دوسری صدی میں مسلمانوں کا بڑا طبقہ کہلا تا تھا۔ بعد میں گو وہ صوفیہ راہِ کبیلہ نے لگا۔ اس طبقہ کا سارا کاروبار ہی سماعِ موتی کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ مزارات، یہ چٹے کشیاں، یہ زیارات و مکاشفات، یہ حاجت روائیاں اور تعزیراتِ امہ غرض جتنی اس طبقہ کے سماعِ موتی کے مسئلہ کی پشت پناہی اور حفاظت کی ضرورت ہے اور کسی مسئلہ کی نہیں۔ اگر قبر میں پتے پتے مجموعے بزرگ قبر پر بیٹھ کر مراقبہ کوئے واسے بزرگ کی بات ہی نہ سن سکیں یا کسی سائل کی یہ بزرگ درخواست سن ہی نہ سکیں تو آگے کام کیسے چل سکتا ہے؟ یہ طبقہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ عام مٹھے ملتے ہیں یا نہیں؟ انھیں اس معاملہ سے کوئی غرض نہیں! انھیں اگر غرض ہے تو صرف یہ کہ اُن کے بزرگ

مردوں کو ضرور سننا چاہیے۔

اب دیکھئے صحابہؓ میں اختلاف صرف اسی ایک مسئلہ سماعِ موتی کے مسئلہ پر ہی ہوا۔ اور بھی کئی مسائل میں ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ اس بات کے قائل نہ تھے کہ اگر پانی نہ لے تو تہنجی شخص صرف تہم سے بھی پاک ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عمار بن یاسرؓ نے اس سلسلہ میں اپنا ذاتی واقعہ بھی پیش کیا اور کہا کہ میں خود ایک دفعہ رسول اللہؐ کے ہمسفر تھے کہ منی ہو گیا۔ پانی نہ ملا تو رمی میں لوٹ پوٹ لگائی۔ پھر نبی اکرمؐ سے واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ صرت اتنا کر لینا ہی کافی تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے اور اپنے چہرہ مبارک اور ہاتھوں کو مسح کیا و حضرت عمرؓ نے حضرت عمار بن یاسرؓ کے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا اور کسی واضح ضعف کے سبب جو ان کو اس روایت میں نظر آیا۔ ان کے نزدیک یہ روایت دلیل نہ ٹھہری۔

مگر دوسرے اختلافی مسائل کا یا تو بعد میں اختلاف ختم ہو گیا۔ جیسا کہ متعدد بالا جنہی کے تہم کے درست ہونے کو بعد کے آدوار میں سب نے تسلیم کر لیا۔ یا اگر با تو اسی حد تک جس حد تک کھڑے صحابہؓ میں تھا۔ مثلاً صبح کی نماز کی سنتیں اگر قضا ہو جائیں تو وہ نماز کے فوراً بعد پڑھی جاسکتی ہیں۔ یا سوچ نہ گئے کے بعد ہی پڑھی جائیں؛ لیکن سماعِ موتی کا مسئلہ ایسا ہے کہ جو دورِ صحابہؓ میں تو معمولی قسم کا اختلافی مسئلہ تھا مگر بعد کے آدوار میں یہ سنگین اور بنیادی قسم کا مسئلہ بن گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک فرقہ کے مجدد کا انحصار ہی سماعِ موتی کے اثبات پر تھا۔

پھر کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو مردوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ مثلاً یہ بات کہ "مُتْرَفٌ یُؤْتِیْہِ" و "مُؤْتِیْہِ" سے ثابت ہے کہ جب مُتْرَفٌ نہلا کہ کھٹا پر رکھا جاتا ہے۔ تو اگر وہ نیک ہو تو قَدْ مُؤْتِیْہِ مُؤْتِیْہِ یعنی مجھے جلدی لے چلا ملدی ہے چلو کہتا ہے۔ اور اگر بُرے ہو تو کہتا ہے کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو وغیرہ۔ لیکن کبھی آپؐ نے مناسبت سے یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؟ اگر زیر بحث آتا ہے تو وہی مسئلہ جو قبر پرستی اور شرک کی بنیاد ہے جس سے ایک طبقہ کا کاروبار بھی وابستہ ہے اور معاش بھی۔ باوجود اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی پُر زور تردید فرمائی تھی، لوگوں نے اس کی راہ نکال ہی لی۔

۱۔ فقہی اختلافات کی اصلیت۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ و نشر و اشاعت۔ علماء اکیڈمی لاہور۔ طبع اول ۱۳۹۵ھ

## چوتھا مرحلہ: آخروی زندگی

پھر مبعث بعد الموت سے لے کر ابد تک مختلہ ہے۔ یہ ذوقِ کمال اور مستقل زندگی ہے۔ مبعث کو جو جسم اس ذوق میں مبتلا کیا جائے گا اس کی شکل و صورت وہی ہوگی جیسی اس دنیا میں تھی۔ اور وہ سب لوگ خواہ جنتی ہوں یا دوزخی ایک دوسرے کو اسی وجہ سے پہچانتے ہوں گے کہ ان کی خطیص اور صورتیں بالکل وہی ہوں گی جو اس دنیا میں تھیں۔ البتہ بعض امارت سے یہ ثابت ہے کہ اس ذوق میں جو جسم رُوح کو عطا کیا جائے گا اس کا سائز اس جسم سے بہت بڑا ہوگا جو اسے دنیا میں دیا گیا تھا۔

اس ذوق کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام بنی آدم اپنے اعمال کی بنیادوں پر گرد ہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس ذوق میں استثنائی صورت یہ ہے کہ دوزخی لوگ تو عذاب کی صورت میں ہر آن موت و حیات سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ جبکہ جنتی لوگوں کے لیے کسی استثنائی صورت کا ذکر نہیں۔

اس ذوق میں جنتی لوگ اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔ وہ اس دن اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھیں گے جیسے اس دنیا میں بد مذکور دیکھ سکتے ہیں اور کوئی اڑجی محسوس نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم اپنے سابقہ مضمون میں بتلا چکے ہیں کہ ان امارت کی روشنی میں نہ کہیں تناسخ کی گنجائش ملتی ہے نہ رُوح اعظم یا رُوح کلی کی اور نہ ہی واصل باللہ، فنا فی اللہ، واصل بحق کی یا ایسے ہی کسی کی ذات میں اللہ کے حلول کرنے کی۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے مروج کے یہ چاروں مراحل بیان کرنے کے بعد فرمایا: **ثُمَّ إِلَٰهٍ تَتَجَعَّلُونَ**۔ آیت کے یہ آخری الفاظ ایسے تمام باطل نظریات کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس **إِلَٰهٍ تَتَجَعَّلُونَ** کے منابض باطلی میں کوئی استثناء بھی نہیں ہے۔

## أرواح کی بین المراحل پیش رفت اور مراجعت

ہم رُوح کے چاروں مراحل کی ترتیب اور ان مراحل میں اگر کسی میں کچھ مثبتیات ہیں تو ان کا جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک ایسے استثناء کا ذکر کریں گے جو مرحلہ ملا کو برے سے ہی حذف کر دیتا ہے۔

**شہداء کی زندگی** | روح کے اس تذریجی سفر میں شہداء کی فضیلت یہ ہے کہ ان سے مرلہ مذکورہ مذکورہ باگیا ہے۔ ان کی قبریں منکر و نیکر کے ذریعہ جانچ ہوتی ہے۔ اور بعض صبح و شام ان پر رحمت کی طرف سے روضہ کھلتا ہے۔ بلکہ وہ شہید ہوتے ہی سیدھے مرلہ مذکورہ میں یعنی جنت میں پہلے جاتے ہیں۔ یہ فرق البتہ ضرور رہ جاتا ہے کہ جنت میں ان کو سبز پرندوں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرلہ مذکورہ میں اعداء کو اسی شکل و صورت کے جسام مہیا کئے جاتے ہیں جو مرلہ مذکورہ یعنی دنیوی زندگی میں تھے۔

اس سے یہ اندازہ لگانا بھی درست ہے کہ انبیاء جو شہداء بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی بھی قبریں جانچ نہ ہو۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جن باتوں کی جانچ ہوتی ہے ان کے معلم تو وہ خود ہوتے ہیں، لہذا ان کی جانچ کیسے؟ ان کی اعداء بھی اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں۔ انبیاء کی دوسری خصوصیات یہ ہیں (۲) ان کے اجساد میں پر حرام ہیں اور (۳) وہ غضاب و فکر کا آواز سن لیتے ہیں دوسرے کوئی نہیں سن سکتا۔

**روحوں کی واپسی** | عام ضابطہ الہی کے مطابق روح کا پچھلے مرلہ کی طرف واپسی کا کوئی قانون نہیں۔ جو مدح میں بتائیں میں ہیں، وہ تو اس لیے دنیا میں واپس نہیں آسکتے کہ وہ اللہ کی حوالات میں مقید ہیں۔ اور جو مدح میں عین یا اعلیٰ علیین (جنت) میں ہیں، وہ جو مدح کی طرح مقید تو نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنت کی نعمتیں یا بلند مقام چھوڑ کر آخر زمین کی طرف کیا لینے آئیں گے؟

اس قانون میں استثناء صرف یہ ہے کہ جب فرشتے کسی انسان کی، خواہ نیک ہو یا بد روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ مدح بتائیں یا عین میں رکھی جاتی ہے۔ پھر اس وقت اس کے جسم کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ جب اس کے عزیز و اقارب اس کے دفن کرنے کے بعد واپس جاتا ہے ہوتے ہیں۔ مدح کا اس وقت لوٹنا نا ایک اضطرابی امر ہے۔ کیونکہ جانچ ہر انسان سے کی جاتی ہے، اس لئے شہداء اور انبیاء کے۔

اس آرائش کے بعد بھی مدح میں بتائیں اور عین میں رہتی ہیں۔ ان مدح کو انہی مقامات پر رہنا ہوتا ہے اور اس کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو مرلہ مذکورہ میں خواب میں ہوتی ہے۔ پھر کبھی کبھی اس غضاب و ثواب میں کچھ اضافہ کی خاطر مدح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ روح کی یہ حیثیت ناچھوٹا بدن کی طرف بازگشت بھی ایک اضطرابی امر ہے۔ اسی گاہے گاہے بازگشت کو



قرآن میں صبح و شام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اضافہ بدن کی شرکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خواب میں کسی شدید واقعہ سے سونے والے کا بدن بھی متاثر ہو جاتا ہے۔  
 یہ معاملہ کروڑوں مرید و عابد یعنی عقیقین اور سچے سچے اپنی قبروں پر شریف لائیں۔ یا ان سے مسلسل رابطہ قائم رکھیں یا اپنی قبروں پر عکس ڈالتی رہیں تاکہ جو کوئی انھیں آکر سلام کہے، اس کے سلام کو سن کر اس کا جواب دیں۔ تو حاشا! وکلا! ان میں کوئی بات بھی رد و حر کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہمارے شعور زندہ طبقہ نے زیر زمین ایک نئی دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ان کے نزدیک عام آدمی نہیں تو کم از کم بزرگ حضرات اپنی اپنی قبروں میں اسی طرح زندہ ہیں جس طرح اس دنیا میں زندہ تھے۔ البتہ ان بزرگوں میں اب تصرف فی الامور کی قدرت دنیا کے لحاظ سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ گویا اس دنیا کے جملہ امتیازات اپنی قوت شدہ بزرگان کو تفویض کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بزرگ لوگوں کی فریاد سنتے بھی ہیں۔ اور اس تکلیف کو دور کرنے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ تو قبر میں دنیا کی طرح زندہ رہنے کے اور بھی زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ دنیا بھر کے مسلمان آپ کے روضہ پر جا کر سلام پڑھتے ہیں۔ اور ان کا آپ کو جواب دینا ہوتا ہے۔ اور جب تک قبر میں زندہ تسلیم کر دیے جائیں۔ وہ سلاموں کا جواب کیونکر دے سکتے ہیں؟ قرآن نے تو کہا تھا کہ "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَقَدْ قُلْتُمُ مَيِّتُونَ" مگر یہ حضرات بعض ہیں کہ رسول اللہ کی ذات تو بڑی قویٰ کی بات ہے۔ ہمارے اولیاء بھی قبروں میں زندہ موجود ہیں۔ موت ان کے لیے صرف ایک پردہ ہے۔ بس جو نبی قبر میں پہنچتے اور دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں تو ان میں یکدم دنیوی زندگی عود کرتی ہے۔ اور کسی عاشق رسولؐ نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ قبر میں رسول اللہ کے وہی اعمال و اشغال ہوتے ہیں جو اس دنیا میں ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ قبر میں ان پر ازواج مطہرات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ نعوذ باللہ من اندوہ و انقراض۔

نگاہِ بازگشت | (۱) روح اللہ کی مخلوق ہے۔ حادث ہے۔ قدیم نہیں۔ اور چونکہ مخلوق ہے، لہذا کسی نہ کسی وقت فنا سے دوچار بھی ہوگی۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ:

”كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۖ وَذُرِّيَّتِي وَبَنَاتِي ۖ ذَوَا الْجَلَالِ ۖ وَالْإِلَٰهَاتُ ۖ“

(الرحمن: ۲۶-۲۷)

”ہر چیز جو اس کائنات میں ہے فنا ہونے والی ہے۔ مرث تیرے بزرگ بزرگوں و گاہر کی ذات باقی رہ جائے گی۔“

۷۔ روح پر پارہ اعلیٰ آتے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں جا کر نئے بدن قلم سے جو آکر کار کا کام دیتا ہے کیونکہ یہی عرصہ دارالامتحان ہے۔ تیسرے مرحلے میں روح کے بدن کا آسرا چھین لیا جاتا ہے اور چوتھے مرحلے میں روح کو نیا بدن عطا کیا جاتا ہے گا۔ تاکہ مرحلہ مکمل کے اعمال کا بدلہ روح اور بدن کی کرمگت سکلیں۔

۲۔ ان چاروں مراحل میں روح زندہ ہی ملتی ہے۔ اور روح ہی وہ شے ہے جو عقل و شعور اور ارادہ و اختیار رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کا دور وہ ہوتا ہے جب روح کر بدن بھی نصیب ہوتا ہے۔ بدن اگرچہ بے جان بہت ہلکا ہوتا ہے مگر عقل و شعور یا ارادہ و اختیار سے ماری ہے۔ تاہم زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے جس مرحلے میں روح کو بدن نصیب نہ ہو وہ موت کا دور کہلاتا ہے۔

۳۔ ان چاروں مراحل میں روح چونکہ زندہ رہتی ہے۔ لہذا چاروں مراحل میں زندگی کے آثار رہتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ آثار چونکہ روح و بدن کے اتصال والی زندگی کی نسبت نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ لہذا ان آوار یعنی مرحلہ مکمل اور مرحلہ مکمل کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۵۔ جن آوار میں زندگی ہی غالب ہے یعنی مرحلہ مکمل اور مرحلہ مکمل، ان میں بھی موت کی استثنائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے اچانک موتی بطور غرق عادت اور خواب بطور عام مضابطہ الہی۔ تاہم یہ موت کے کمزور سے آثار غیر مسلسل اور غیر مستقل ہوتے ہیں۔

۶۔ بعینہ موت کے دور یعنی مرحلہ مکمل میں بھی استثنائی صورتوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ آثار حقیقی زندگی کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہوتے ہیں۔ جیسے عذاب قبر جو آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ اور سماع موتی کا مسئلہ بطور غرق عادت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کسی مردہ کی روح کو سنا دیتا ہے۔ اس میں اس مردہ کی روح کے ارادہ و اختیار کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔

۷۔ مرحلہ مکمل میں روح کا مستقر علیین یا سمین ہے۔ اس مرحلے میں عذاب و ثواب قبر کا تعلق براہ راست روح سے ہوتا ہے۔ اور یہ عذاب و ثواب آخرت کی نسبت ہلکا اور غیر مسلسل ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ عذاب براہ راست روح جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

۸۔ شہدار اور اذیابیا سے مرحلہ مکمل عذوب کر دیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی ان پر موت کے پہلے زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی دنیاوی زندگی کی طرح نہیں ہوتی۔ اس زندگی

کی کیفیت کو سمجھنا ہمارے شعور سے ماورا رہے لہذا ہم ان کی اس زندگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔  
 ۹۔ رسول اللہ پر صلوٰۃ و سلام، دُعا کے سوا یا قبر پر، صیغہ غائب سے ہوا مخاطب سے بھی نہیں فرشتوں کے ذریعہ آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی مفردی نہیں ہے کہ آپ پر سلام کہنے والے کو جواب دیں۔ یہ سلام امت کی طرف سے اجتماعی طور پر فرشتوں کے ذریعہ پہنچاتے جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ اجتماعی طور پر جواب کے طور پر امت کے لئے سلام کہتے یا سلامتی کی دعا کہتے ہیں۔ کیونکہ راجع قول یہی ہے کہ آپ پر جو سلام و صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وہ سلام دعا ہے نہ کہ سلام تحیۃ۔ اسی طرح قبرستان میں جا کر مسلمانوں کو جو اسلام علیکم کہا جاتا ہے۔ وہ بھی سلام دعا ہے، سلام تحیۃ نہیں۔

۱۰۔ قرآن کرام کی پر زور تردید کرتا ہے۔ صحیح احادیث، استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور جمعی احادیث سمایح سوئی کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بندگان کرام کے اقوال اور ان کی خوابیں اس جواز کو تائید مزید بخشتی ہیں۔ اب مشکل یہ ہمیش آتی ہے کہ اگر ان بندگان کرام کا احرام ملحوظ رکھ کر یہ سب درست تسلیم کر لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جعلی احادیث اور بزرگوں کی خوابیں اور اقوال و اعمال قرآنی آیات کا رد پیش کر رہے ہیں۔  
 لہذا ماضی و حاضر ائمہ با اصول!



برزخی قبر اور برزخی جسم سے تعارف

مسئلات  
(۱)

روح۔ مقام قبر۔ سماع موتی

(یہ جوابات محدث رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ میں شائع ہوئے)

مقالہ مذکورہ کی اشاعت کے بعد مجھے تین حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں مختصر خط تو جناب اسحاق صاحب (مدنیہ منورہ) کا تھا جنہوں نے ایک موضوع حدیث کی نشان دہی فرمائی اور جس کا ذکر پیش لفظ میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ ہم اس نشان دہی کے لیے آپ کے مشکور ہیں۔ یہ حدیث چونکہ محض تائیداً درج کی گئی تھی، لہذا اس کتاب سے خارج کر دی گئی ہے۔

باقی دو حضرات کے خطوط خاصے طویل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات ڈاکٹر کیپٹن مسعود عثمانی (توحید روڈ، کیمپری، کراچی) کے نظریات برزخی قبر، برزخی مقام اور برزخی جسم سے کافی متاثر ہیں۔ پھر اسی مرکزی نقطہ نظر کے مطابق کچھ سوالات، کچھ اشکالات، کچھ اعتراضات پیش کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کو من و عن درج کرنا تو بہت طوالت کا باعث ہوگا، میں مختصر ان کے سوالات یا

اشکالات کو پیش کروں گا، اس اقتیاد کے ساتھ کہ ان کا اصل مفہوم اوچھل نہ ہونے پڑے۔ پھر ان کے جوابات عرض کروں گا۔ وھا تو فیقی الا باللہ۔

ان میں سے پہلے مستفسر توجنا ب شاہ فاروق ہاشمی صاحب (ٹیچر گورنمنٹ پرائمری سکول قائد آباد۔ ضلع خوشاب) ہیں۔ ان کا غلط سب سے پہلے موصول ہوا اور سب سے زیادہ طویل ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کو دلائل سے پیش کیا ہے پھر میرے پیش کردہ نظریہ پر کچھ اشکالات پیش کیے ہیں۔

اور دوسرے مستفسر جناب عبدالقادر سومر صاحب (کیمیاڑی۔ کراچی) ہیں جو ہمارے پرانے کرمفرما ہیں۔ انہوں نے اس نظریہ کی تائید میں مندرجہ ذیل کتابوں میں سے موضوع زیر بحث سے متعلقہ فوٹو سیٹ بھیجے ہیں۔ اور ساتھ کچھ رجال کی کتابوں میں سے متعلقہ راویوں پر تنقید کے فوٹو سیٹ بھی۔ ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ندائے حق از محمد حسین نیلوی۔

۲۔ دُعا کرنے کا اسلامی دستور از فضل الرحمن کاشمیری۔

۳۔ توحید خالص قسط علیہ قبر یہ آستانے از ڈاکٹر مسعود عثمانی۔

۴۔ ہفت مدۃ الاسلام کے ایک مضمون ”مسئلہ سماج موتی“ سے چند اقتباسات۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومر و صاحب ایک طرف میرے پیش کردہ نظریہ سے

متاثر ہیں۔ دوسری طرف مذکورہ بالا کتب میں پیش کردہ نظریہ سے بھی متاثر ہیں۔

لہذا وہ متذبذب ہیں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم مستفسر مد کے دلائل، اس کا جواب اور ان دلائل کا جائزہ

پیش کریں گے:

۱۔ قبر کا اصل مقام،

اس دعوے سے متعلق کہ ”قبر سے مراد زمینی گڑھا یا حتی قبر نہیں بلکہ بزرگی قبر ہے“

مستفسر مد کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ قرآن میں حضرت نوح کی قوم کے متعلق آیا ہے کہ ”أَعْرِضُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا“

اور فاتحیہ کے لیے آتی ہے۔ حالانکہ قوم نوح کو، اور اسی طرح قوم فرعون کو بھی،

قبر نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ اور قرآن نے یہ کلیہ بھی بتلایا ہے کہ ”شَعْرَامَاتٌ فَأَقْبَرُہُ“ (۳۱:۸) اللہ نے انسان کو موت دی پھر اسے قبر میں داخل کیا۔ یعنی ان غرق ہونے والوں کو زمینی قبر تو نصیب ہی نہ ہوئی تھی لیکن عذاب مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پھر مرنے کے ساتھ ہی قبر کا ذکر بھی موجود ہے۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔ اور یہ گڑھا تو مجازی قبر ہے جو دنیا میں بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ب: حدیث میں آیا ہے:  
 اِنَّمَا مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی یَہُودِیَّةٍ یُسْبِکُ  
 عَلَیْہَا لَقَآلَ اِنْ مَرَرْتُمْ لَیْسَ بِکُمْ عَلَیْہَا ذَلَّیْمًا لِّتُعَذَّبَ فِیْ قَبْرِہَا“  
 (مشکوٰۃ باب البکا علی المیت)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودیہ پر گزرے جس پر رو یا جبارہ تھا تو آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ اس پر روتے ہیں جبکہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔“

اس یہودیہ کے متعلق جس کا جنازہ دیکھ کر ہی آپؐ نے فرمادیا تھا کہ اسے اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برزخی قبر ہے۔ جہاں وہ دفن ہونے سے پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھی۔  
 ج: جب بعزہ قیامت مڑے اپنی اپنی قبروں سے جی اٹھیں گے تو اس وقت سے پہلے ہی موجودہ زمین و آسمان تو ختم ہو چکے ہوں گے۔ پھر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا کیسے لیا جاسکتا ہے؟

۲۔ کیا عذاب قبر کا تعلق جسم سے بھی ہے؟

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ عذاب قبر سے طبعی نہ طبعی نہ جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ خواہ یہ مقدار کتنی ہی کم یا گاہے گاہے ہو، لیکن ہوتا ضرور ہے اور اس پر دلیل یہ تھی کہ جیسے نیند میں بعض اوقات رُوح کو وارداتِ رنج و راحت سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے اسی طرح عذاب قبر سے جسم بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس پر آپؐ نے دو اشکال پیش کیے ہیں:

(۱) فرعون کا جسم دنیا میں موجود ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح بھی فرمادی کہ

”فَالْيَوْمَ نُفَجِّعُكَ بِبَدَنِكَ“ تو پھر عذاب میں جسم کی شمولیت کیونکر ہوئی؟

(ب) کا فر قیامت کے دن نہیں گئے؛

”مَنْ بَعَثْنَا مِنْهُنَّ قَدْ نَاءَ“ (یونس: ۵۷)

”ہمیں ہماری آرام گاہ سے کس نے اٹھا دیا؟“

اب اگر اس زمینی گڑھے کو قبر، اور جسم سے عذاب کا تعلق بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ قبر عذاب گاہ ہوئی۔ آرام گاہ کیسے ہوئی؟

یہ تو ہیں فاروق صاحب کے دلائل! — اور سومر و صاحب نے جو کتابوں

سے فوٹو سیٹ بھیجے ہیں، ان سے بھی اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بس انداز بیان الگ الگ ہے۔ میرے خیال میں یہ حضرات دوسری انتہاء کو پہنچ گئے ہیں۔ سب سے موتی کے قائلین اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر میں مردہ ہر واقعہ کار کا سلام سنتا اور پھر اس کا جواب دیتا ہے یا یہ کہ ”مَنْ فِي الْقَبْرِ“ سے مراد مردہ دل لوگ ہیں۔ جبکہ ہمارے یہ کرم فرما اس انتہاء کو پہنچے کہ قبر کا معنی ہی بدل دو، پھر سلام کیا، اس کا سنا اور جواب دینا کیسا؟ نہ رہے بانس نہ بچے بانسری۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ تاویل و تعبیر کی ہے وہ اس لیے کی ہے کہ شرک کے اس سبکے بڑے چور و دروازے کی جبر ہی کٹ جائے۔ ان کا یہ غلو ص نیت و درست اور مبارک، مگر ہمیں افسوس ہے کہ حقائق اس کی تائید نہیں کرتے۔ بھلا سوچئے اگر قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہ ہو بلکہ بزغی مستقر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدرکے خونیں پر جا کر ان مردہ کنار کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ اپنی جگہ پر بیٹھے یا کھڑے ہی یہ خطا فرما دیتے؟ اسی طرح آپ بقیع میں جا کر یوں دعائے مغفرت فرماتے تھے؟ اور آخر قبرستان میں جا کر ہی یوں آپ السلام علیکم یا اہل القبر کہتے ہیں؟

اب میں اپنے نظریہ کی تائید میں چند مزید احادیث صحیحہ پیش کر دوں گا:

پہلی حدیث:

”عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ يُعَذَّبَانِ فَقَالَ إِنَّهُمَا يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِيْهِمَا؟ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَبِرُّ مِنَ الْبُؤْسِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِيْ بِإِلَهِكُمْ حِمَّةً۔ تَعْرِ أَخَذَ

جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً  
فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ لِمَ صَنَعْتَ هَذَا؟ فَقَالَ:  
”لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يُخَفِّسَا“

(بخاری۔ کتاب الجنائز۔ باب الجرید علی القبر)  
”ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں پر گڑھے  
جنہیں عذاب ہو رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا، ”ان دونوں قبر والوں کو عذاب  
دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی پاداش میں بھی نہیں۔ ایک تو پیشاب  
سے بچاؤ نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا پھرتا تھا“ پھر آپؐ نے کھجور  
کی ایک ہری ڈالی لی اور اُس کو نیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کیے اور ہر  
قبر پر ایک ایک کو گاڑ دیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے  
ایسا کس لیے کیا؟“ آپؐ نے فرمایا۔ ”جب تک یہ ڈالیاں نہ سونگھیں  
شائد ان کا عذاب ہلکا ہو۔“

اب دیکھیے اس حدیث سے مندرجہ بالا دونوں اشکالات ختم ہو جاتے ہیں۔

وہ یوں کہ:

۱۔ لفظ ”مَنْ يَنْتَبِئُنِ“ اس بات کا متغاضی ہے کہ قبر سے مراد یہی زمینی گڑھے  
ہیں نہ کہ برزخ میں رُوح کا مستقر۔

۲۔ آپؐ نے اسی قبر پر ہری ڈالی گاڑی جس میں جسم مدفون تھے اور فرمایا کہ شائد اس  
سے عذاب ہلکا ہو۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جسم بھی عذاب سے متاثر ہوتا ہے۔

دوسری حدیث:

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ قَالَ أَخْرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ  
وَجَدَتِ الشَّمْسُ نَسِيعَ صَوْتًا فَقَالَ: يَمُودُ تَعَذُّبٌ فِي  
قُبُورِهَا“ (بخاری، کتاب الجنائز، باب لتعود من عذاب القبر)

”ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ سے)  
باہر نکلے اور اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ آپؐ نے ایک  
آواز سنی تو فرمایا، ”یہودیوں کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے“



اگر قبر سے مراد بزرگی قبر لی جائے تو لفظ "خروج" بے کار ہے۔ مدینہ میں رو کر بھی آپ یہ بات بیان فرما سکتے تھے۔ آخر آپ نے قبروں کے پاس جا کر میوں ایسے فرمایا؛  
تیسری حدیث:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ أَسْوَدَ رَجُلًا أَوْ امْرَأَةً كَانَ يَقُومُ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ وَلَمْ يَعْلَمْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَوْتِهِ فَذَكَرَهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: "مَا فَعَلَ ذَلِكَ الْإِنْسَانُ؟" قَالُوا: "مَاتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ" قَالَ: "أَفَلَا أَذْنَمُونِي؟" فَقَالُوا: "إِنَّهُ كَانَ كَذَّاءً وَكَذَّاقِصَةً" قَالَ فَحَقَّرَ زَأْسَانَهُ - قَالَ، فَذَلَّلُونِي عَلَى قَبْرِهِ فَأَتَى قَبْرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ (بخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوة على القبر بعد ما يدفن)

"ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک کالا مرد (یا کالی عورت) مسجد میں چھانو دیا کرتا تھا۔ وہ مر گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی۔ ایک دن آپ نے اُسے یاد فرمایا اور پوچھا کہ "وہ کہہ رہا ہے اسے کیا ہوا؟" لوگوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! وہ تو مر گیا ہے" آپ نے فرمایا "تو پھر تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟" لوگوں نے عرض کیا کہ یوں ہوا اور یوں ہوا۔ غرض اس کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اسے درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے آپ کو اس کی موت کی اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ آپ نے فرمایا "مجھے اس کی قبر پر لے چلو" راوی کہتا ہے کہ پھر آپ اس کی قبر پر آئے اور اس پر نماز جنازہ پڑھی۔

یہ حدیث بھی اپنے مضمون میں صاف ہے کہ (۱) قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے ورنہ آپ اس کی قبر پر میوں تشریف لے گئے؛ (۲) یہ کہ قبر پر آخر دعائے استغفار کرنے یا نماز جنازہ پڑھنے سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ اس قبر میں جو جسم پڑا ہے اس کا عذاب و ثواب قبر سے تعلق ضرور ہے۔

اور قرآن میں یہ الفاظ وَلَا تَقْبُرُهُمْ عَلٰی قَبْرِهِمْ سے مراد زمینی گڑھا ہونے کی پوری وضاحت ہو چکی ہے۔ مستفسر اس کے دلائل کا جائزہ لے اب ہم فاروق صاحب کے دلائل پر تبصرہ

کرتے ہیں۔

۱۔ یہ مفروضہ کہ ”یہ دنیاوی (حسی) قبر تو لم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے“ درست نہیں۔ جن اقوام پر خدا کا عذاب آیا اور قرآن میں مذکور ہے۔ اگر صرف ان کا مناسب نکالا جائے تو بھی یہ مفروضہ درست ثابت نہیں ہوتا بلکہ بشمار ایسی اقوام ہیں جن پر عذاب نہیں آیا۔ وہ لوگ اپنی طبعی موت مرتے رہے اور زمین میں دفن ہوتے رہے اور یہ سلسلہ ابتدائے لوح انسان سے جاری ہے۔ یعنی جب قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا جو اس دنیا میں پہلا قتل بھی تھا اور پہلی موت بھی تو اسے اللہ کی طرف سے مردہ کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا گیا اور یہی طریقہ تمام انبیاء سکھاتے رہے۔ لہذا قاعدہ کلیہ کے طور پر یہی بات بھی جاسکتی ہے کہ انسان مرنے کے بعد قبر میں دفن ہوتا ہے۔ اب اگر آل فرعون یا قوم لوح غرق ہو گئے یا اہل سبا پر سیلاب آیا یا دنیا بھر میں سے ایک قوم (ہندو) اپنے مُردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلادیتی ہے تو یہ سب باتیں مستثنیات میں شمار ہوں گی اور آج اگر کوئی چاہے تو خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قبر میں دفن ہونے والوں کی تعداد ڈوبنے یا جلنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ لہذا عام قاعدہ کے طور پر جو بات بھی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ ”تَحْتَ أَمَاتٍ فَأَقْبَرَتْ“ باقی سب استثناء کی صورتیں ہیں جیسا کہ عذاب قبر بذات خود ایک استثنائی صورت ہے جس کی تفصیل میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ یہ دور قرآن کی زبان میں موت کا دور ہے نہ کہ زندگی کا۔

۲۔ آپ نے جو حدیث اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش فرمائی ہے اس کے الفاظ ہیں: ”مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى يَمُودٍ نَيْتٍ“ یعنی آپ ایک یہودی پر گزرے جس پر لوگ رورہے تھے ”اس حدیث میں قطعاً یہ وصاحت نہیں کہ آپ اس کے جنازے یا میت پر گزرے یا اس کی قبر پر؛ اغلب گمان یہی ہے کہ آپ اس کی قبر پر گزرے تھے جیسا کہ اس مشکوٰۃ کے ترجمہ سے بھی ظاہر ہے۔ ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

”گزرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزدیک قبر ایک عورت یہودیہ کے کہ روایا جاتا تھا اس پر یہ مشکوٰۃ، باب البکاء علی المیت مطبوعہ مکتبہ اثریہ

سانگلہ ہل ص ۱۸۲)

۳۔ تیسری دلیل یہ تھی کہ جب زمین ہی بدل جائے گی تو یہ زمینی گودھا کہاں رہے گا؟ سو گزارش ہے کہ زمین بدل ضرور جائے گی لیکن نیست و نابود یا فنا نہیں ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ ”يَوْمَ بُدِّلُ الْأَرْضُ عَلَىٰ الْأَرْضِ“ بہر حال اس وقت بھی کوئی نہ کوئی زمین ضرور ہوگی جو اگرچہ یہ موجودہ زمین نہ ہوگی تاہم اسی زمین کی بدلی ہوئی شکل ہوگی۔

۴۔ جسم کے عذاب سے بے تعلق ہونے کی دلیل جو لفظ مرقد (خواب گاہ یا آرام گاہ) سے لی گئی ہے۔ یہ بھی وضاحت کے لحاظ سے سودمند نہیں۔ ان کفار کا یہ قول تو صرف انسانی فطرت کا مظہر ہے۔ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ پھر اس سے بڑی مصیبت یا آفت اس پر آن پڑے تو اسے یہ چھوٹی مصیبت کا زمانہ آرام کا زمانہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا جب کافر ”اشد العذاب“ کو دیکھیں گے تو انہیں یہ ظم عذاب والی جگہ اس کے مقابلہ میں مرقد ہی معلوم ہوگی۔ اب خواہ یہ عذاب حسی یا مادی قبر میں ہو رہا ہو یا برزخی قبر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ رہا یہ سوال کہ فرعون کو مرنے کے وقت سے لے کر عذاب ہو رہا ہے مگر اس کا جسم بمصدق ارشاد باری تعالیٰ عذاب کے اثرات سے محفوظ و مامون ہے۔ تو یہ محض ایک استثنائی صورت ہے، جس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ، کسی بھی انسان کا جسم خواہ وہ نیک ہو یا بد، عذاب و ثواب قبر سے یکلے اور کبھی بھی متاثر نہیں ہوتا، درست نہ ہوگا۔ اوپر درج شدہ احادیث ہمارے اس خیال کی تائید میں پوری رہنمائی کرتی ہیں۔

۳۔ روحوں کی ملاقات،

اس سوال میں آپ نے کئی اشکالات کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً،

(۱) خواب میں جب روح کلبن سے علیحدگی ہو گئی تو اسی الفکاک روح ہی کا نام تو موت ہے۔ پھر اگر جسم کو بھی عذاب و ثواب میں شریک سمجھ لیا جائے تو یہ زندگی ہوئی موت تو نہ ہوئی؟

(۲) خواب میں کسی شخص کی روح جب کسی سرے ہوئے ظالم انسان کی روح سے،

جو جن میں مقید ہے، ملتی ہے تو کیا اس سونے والے شخص کی رُوح وہاں پہنچ جاتی ہے یا اس ظالم اور ڈاکو انسان کی رُوح وہاں سے آزاد ہو کر اسے خواب میں آکر گھس لاتی دھمکاتی ہے؟ وہ ضابطہ الہی کو توڑ کر اس دنیا میں کیسے آ جاتی ہے؟

۳۔ ایک ہی خواب میں ایک رُوح کئی آدمیوں کو خواب میں ملتی ہے تو کیا ایک ہی رُوح سب کو ملتی ہے یا علیحدہ کوئی رُوح؟

ان سوالوں کا جواب دینے کی بجائے میں فاروق صاحب کو یہ مشورہ دوں گا کہ میرے مضمون کا متعلقہ حصہ دوبارہ غور سے پڑھ لیں، خصوصاً ص ۲۴ کا یہ پیرا کہ: ”یہ ایسے بدیہی مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا ہے۔ اب اگر انسان ان تجربات و مشاہدات کی وجہ یا اسباب و علل تلاش کرنا شروع کر دے تو وہ اس میں ناکام ہی رہے گا۔ یہی بڑھ حقیقت ہے جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی کہ: ”وَمَا أَدْرِنتُمْ فِیْمَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“

لہذا میرا غلصہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ایسی باتوں کے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں جن کا سمجھنا انسان کی عقل سے ماوراء ہے۔ نہ ہم ان باتوں کے سمجھنے کے مکلف ہیں اور نہ ایسی باتیں اعتقادات میں کوئی مقام رکھتی ہیں۔

۴۔ حدیث اور قبر،

حدیث اور قبر کا فرق میں نے یہ بیان کیا تھا کہ قبر وہ ہے جس کے نشانات موجود ہوں اور حدیث وہ ہے جس کا سرے سے کوئی نشان ہی نہ تھا یا نہ ہو۔ اس پر آپ نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قیامت کے دن مردوں کے قبروں سے جی اٹھنے کے متعلق قرآن نے جیسے حدیث کا لفظ استعمال فرمایا دے ہی قبر کا بھی فرمایا ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ زمین ہی بدل چکی ہوگی تو پھر ان میں فرق کیا ہوا؟

چنانچہ جہاں میں نے یہ فرق بتلایا تھا، وہاں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ یہ میرا اپنا فہم ہے اور مجھے اپنے فہم کو دوسروں سے تسلیم کروانے پر قطعاً کوئی اصرار نہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس پر اہل لغت کا اتفاق بھی ہے کہ دو مترادف الفاظ میں کچھ نہ کچھ ذیلی فرق ہوتا ضرور ہے۔ ورنہ ایک کے بعد دوسرے لفظ کے وجود میں آنے کی کوئی

وجہ نہیں۔ اب میرے اس فہم کی مزید وضاحت یوں سمجھئے کہ قبر کا لفظ عام ہے اور جدت خاص ہے۔ ہر جدت قبر ضرور ہوتی ہے مگر ہر قبر جدت نہیں ہوتی۔ امید ہے اب آپ یہ فرق اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

۵۔ سماع موتی ۱

اس مسئلہ میں فاروق صاحب کا رویہ شدید اور انتہا پسندانہ ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کوسے سماع موتی ثابت نہیں ہوتا تو پھر سماع موتی کا قائل مومن ہے یا کافر؟ نیز یہ کہ قلیب بدر کے واقعہ کے فہم میں جب حضرت عائشہؓ کا مقام بلند تر ہے تو پھر جو شخص بلند تر سے کم تر کی طرف رجوع کرے اس کے متعلق آپ کا فتویٰ کیا ہے؟

اس سلسلہ میں میں کوئی فتوے دینے کے حق میں نہیں، البتہ یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اتنے تشدد نہ ہوں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگر سماع موتی کے قائل تھے تو اس کا حوالہ کیا ہے؟ سو اس کے حوالہ کے لیے دیکھیے ”جمع العوائد“ ج ۲، ص ۶۷۹ طبع ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء مطبوعہ مدنیہ منورہ۔ الفاظ یہ ہیں:

”رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقِفُ عَلَى قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَصَلَّى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبَى بَكْرًا وَعُمَرَ زَوَاهُ  
مَا لَكَ“

نیز حواہ المغایع شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۵۰۵، الفاظ یہ ہیں:

”قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: ”مَا نَعْلَمُ أَحَدًا عَنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَّ ذَلِكَ إِلَّا ابْنُ عُمَرَ“ (رواہ عبد الرزاق)

یعنی تمام صحابہؓ میں سے صرف عبداللہ بن عمرؓ ہی رسول اللہ کی قبر پر  
دُور و پُڑھتے تھے۔ دُوسرا کوئی صحابی یہ کام نہ کرتا تھا۔

دوسرے مستفسر جناب سومر صاحب نے مندرجہ ذیل تین امور کی طرف  
توجہ دلائی ہے:

۱۔ قبر کا معنی اور مقام؛

اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر پیش کر چکا ہوں اور دلائل کا جائزہ بھی ان کے

اس سوال کے لیے بھی وہی جواب کافی ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

## ۲۔ نقدِ احادیث:

اس سلسلہ میں آپ نے دو احادیث پر تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) سیاح فرشتوں والی حدیث (جو نسائی میں مذکور ہے) کے متعلق آپ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی "نراذان" ہے جو مجروح ہے اور شیعہ بھی ہے، لہذا یہ حدیث موضوع ہے۔

(۲) "رَدَّ اللہُ عَلٰی مَنْ جَعَلَ" (ابوداؤد بیہقی) کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں دو راوی ابو صخر حمید بن زیاد اور یزید بن عبد اللہ بن قسیط مجروح ہیں، لہذا یہ حدیث بھی مجروح یا موضوع ہوئی۔

پھر انہی باتوں کی تحقیق کے لیے آپ نے مختلف محنت رجال سے فوٹو سٹیٹ بھی بھیجے ہیں اور مذکورہ بالا کتابوں کے فوٹو سٹیٹ بھی۔ تاکہ ان مصنفین کے تبصرہ کا بھی علم ہو سکے۔

حدیث پر تنقید کرنا ایک مستقل فن ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد تمام راۃ کے حالات زندگی اور ان کے باہمی روابط سے واقف ہونے کے علاوہ اصولِ حدیث سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہو اور یہ کام ہر کس و نا کس کے بس کا لوگ نہیں یہاں کی کتابوں کے تبصرہ پر انحصار کر کے کسی حدیث پر تنقید کر دینا بھی غیر محتاط روش ہے نیز کہ بسا اوقات کسی ایک راوی سے متعلق تبصروں میں اختلاف ہوتا ہے، جیسا کہ خود جناب محمد حسین صاحب نیلوی نے اپنی کتاب "تذکرۃ حق" کے ص ۱۹۵ پر خود اس بات کا اعتراف کیا ہے، وہ ابو صخر بن زیاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اسے واقعی کئی اصحاب جرح و تعدیل نے ثقہ لکھا ہے مگر بعض دوسرے محققین نے اس کی تضعیف بھی کی ہے۔"

اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک محدث کسی راوی کو ضعیف قرار دینے کے باوجود اس سے حدیث روایت کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہی حدیث بعض دوسرے طریقوں سے مذکور ہوتی ہے جس کے تمام تر رواۃ ثقہ ہوتے ہیں۔ لہذا اندر میں صورت حال محدث اس ضعیف راوی کی روایت

کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ اسی بنا پر نیلوی صاحب کو اپنی کتاب ”نوائے حق“ کے  
 ص ۱۹۵ پر یہ فقرہ بھی لکھا پڑا کہ کسی راوی کے متعلق ”صرف اتنا کہ دنیا کہ صحیح مسلم کا  
 راوی ہے لہذا قوی ہے یعنی برہم چل ہے“ (یہ فقرہ یزید بن عبد اللہ بن قیسط پر تبصرہ  
 کے ضمن میں آپ نے لکھا ہے) پھر اس صورت حال میں کئی مسئلہ کے مخالف و  
 موافق دونوں بھیجے جان کر کے اپنا اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہذا مسلک اعتدال  
 یہی ہے کہ انسان غیر جانبدار ہو کر ان کتب کی طرف رجوع کرے اور اس سے  
 زیادہ محتاط مسلک یہ ہے کہ کئی محدث کے تبصرہ پر قناعت کرے۔

لہذا ہم ان دونوں احادیث کو موضوع بحث کے حق میں نہیں۔ زیادہ سے زیادہ  
 انہیں ضعیف روایات ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور ضعیف روایت تائید کے طور پر  
 پیش کی جاسکتی ہے۔ البتہ جب ایسی حدیث اپنے مضمون میں منفرد ہو تو اس سے  
 احتجاج درست نہیں؛ بالخصوص اعتقادات میں!

اور یہ تبصرہ بھی ہم نے ان مصنفین حضرات کی تحقیق کو ملحوظ رکھ کر پیش کیا ہے  
 حدیث بہت سے محدثین سیاح فرشتوں والی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو  
 جمع الفوائد ج ۲ ص ۶۷۹ حدیث ۹۵۷۵ (مطبوعہ مدینہ منورہ کعب ۱۳۸۱ھ) الفاظ  
 یہ ہیں:

(۱) ”نَدَاہُ اَيْضًا اَحْمَدُ ابْنُ حَبَّانَ وَ اَنَحَاكُمُ وَصَحَّحَ،  
 وَ اَقْرَبُهُ الدُّمَيْشِيُّ وَقَالَ التَّنَبُّخِيُّ رَجَالَہُ بِجَالِ الصَّحِيحِ وَ  
 قَالَ الْعِرَاقِيُّ الْحَدِيثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ دُونَ قَوْلِهِ سَيِّئًا جِدًّا  
 كَذَا فِي الْفَيْضِ“

”اس حدیث کو احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا اور اسے  
 صحیح کہا، اور ذہبی نے اس روایت کو پائیدار سمجھا اور دمشقی نے کہا کہ  
 اس کے تمام راوی صحیح ہیں اور عراقی نے کہا کہ یہ روایت ”سیئہ علیین“  
 کے لفظ کے علاوہ متفق علیہ ہے۔ ایسا ہی فیض القدر شرح جامع المغیر  
 میں بھی لکھا ہے“

(۲) ”رَدَّ اللّٰهُ عَلٰی رُوْحِنِ“ والی روایت کو سیوطی نے ضعیف قرار دیا ہے۔“

(جامع الصغیر ج ۲ ص ۱۲۸) تاہم موجودہ دور کے محدث البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ گو یہ حدیث صحیح کے درجہ کو نہیں پہنچتی۔ تاہم حسن ہے، ضعیف نہیں۔ ان تبصروں کے بعد اس تیسرے طبقہ کے حضرات کے تبصروں کو سامنے لائیے، تو خود بخود یہ معلوم ہو جائے گا کہ پہلے انہوں نے ایک نظریہ قائم کیا کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا نہیں۔ پھر ایسی احادیث کو مجروح یا موضوع ثابت کرنے کے لیے اعتدال کی راہ سے ہٹ کر کھینچنا ان سے کام لیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ:

”قرآن سراج موتی کی پر زور تردید کرتا ہے، احادیث صحیحہ استثنائی صورت پیش کرتی ہیں۔ ضعیف اور وضعی روایات اس کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ اور بزرگوں کے اقوال اور فرامین قرآن کا رد پیش کرتے ہیں۔“

۳۔ تاویل حدیث:

سومرو صاحب لکھتے ہیں کہ:

”احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ”مردہ کو جب کندھوں پر اٹھایا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی لے چلو۔۔۔۔۔“ اس حدیث سے بھی تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حدیث کا بعینہ وہی مطلب نہیں ہوتا جو اس کے ظاہری الفاظ سے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس اشکال والی حدیث کا، کسی دوسری اشکال والی حدیث کو ملحوظ رکھ کر مطلب سمجھا جائے گا۔“

پھر مثال کے طور پر جو دوسری اشکال والی حدیث آپ نے درج فرمائی وہ

یہ ہے کہ:

”بندہ جب نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تا آنکہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“



یہ حدیث درج کرنے کے بعد سومر و صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی وحدۃ الوجود یا حلولی یہ کہہ دے کہ خدا تو خود مجتہد ہے کہ میں اس کے اعضاء بن جاتا ہوں تو عیسٰی اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ اس کے یہ معنی نہیں، یہ تو انداز بیان ہے؛"

غور فرمائیے کہ اگر کسی ایسے صوفی کو یہ کہا جائے کہ یہ تو محض انداز بیان ہے تو کیا وہ آپ کے اس جواب سے مطمئن ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، صرف انداز بیان کہنے سے وہ بھی مطمئن نہیں ہوگا، بلکہ اس کے اطمینان کے لیے اسے حدیث کا مطلب سمجھنا پڑے گا اور اسی حدیث کے مطلب میں نظریہ حلول کا پورا رد موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ حلولی یا وحدت الوجودی جہد اور معبود ہونے کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کا ایک حصہ اور اس کا ہر تصور کرتا ہے جبکہ یہ حدیث شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ "جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کر لیتا ہے۔" گویا جہد اور معبود کا تصور ہی اس حدیث کی بنیاد ہے۔ رہا اس کے اعضاء کا اللہ کے اعضاء بن جانے کا مسئلہ، تو اس کو جب پہلے حصے سے متعلق کیا جائیگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس بندہ کے اعضاء سے منشاء الہی کے خلاف کوئی کام صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو کچھ خدا چاہتا ہے وہی کچھ اس کے اعضاء کرنے لگتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس بندے کے اعضاء پر منشاء و منشاء الہی اتنی محیط ہو جاتی ہے کہ منشاء الہی کی تنفیذ کے لیے اس کے اعضاء آلہ کار کا کام دینے لگتے ہیں اور یہی عبودیت کا بلند مقام ہے جو حلولی اور وحدت الوجودی نظریہ کی عین ضد ہے۔ حلولی نظریہ میں عبادت عیسیٰ اور تقرب الی اللہ کیسیا؟ پھر اس حدیث کے لگے الفاظ یوں ہیں،

"وَمَا سَأَلْنِي لَأَمْحُطِيكَ وَلَا كَيْفَ اسْتَعَاذَنِي لَأَعِيذَنِي"۔

(بخاری کتاب الزقاق)

"اور اگر وہ (میرا مترب بندہ) مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے

دیتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں پناہ دیتا ہوں۔"

گویا اس حدیث کا پہلا حصہ بھی جہد اور معبود کے تعلق کو واضح کر رہا ہے اور آخری حصہ بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے، تو پھر ہمیں اس حلولی کو محض انداز بیان کہہ کر مطمئن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں تو اس حدیث سے اس کا پورا پورا رد کرنا

چاہیے اور یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ اس سیاق و سباق کے درمیان والی عبارت کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے نہ وہ جو تم سمجھ رہے ہو۔ پس یہ عمن انداز بیان نہیں! اس حدیث کے درج کرنے سے غالباً آپ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جیسے اس اعضا والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے، اسی طرح اس مژدے کے کلام کرنے والی حدیث کے ظاہری الفاظ اور ہیں اور مطلب اور ہے۔ اور وہ مطلب یہ ہے کہ ہم نہ تو مردہ کے ہونٹ ہلے دیکھتے ہیں، نہ ہی اس کی آواز سنتے ہیں۔ مگر ظاہری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردہ بولتا ہے۔ اسی طرح عذاب قبر کے سلسلہ میں جو قبر کا ظاہری لفظ ہے۔ اس سے مراد زمینی گڑھا لینا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں ہمیں اس مردہ کے بولنے والی حدیث میں بھی کسی قسم کی تاویل کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ہم اس کا کلام سن یا سمجھ نہیں سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ: "وَلَا يَمُنُّ شَيْءٌ إِلَّا بِشَيْءٍ بِحَدِّهِ وَلَكِنْ لَا تَعْقِلُونَ تَسْبِيحُكُمْ" (یعنی سربل)۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ حمد بیان کرتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کر سکتے نہیں۔ تو جب ہم اتنی غیر التعداد اشیاء کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، اور ہمارے اس نہ سمجھنے کی وجہ سے نہ تو ان کی تسبیح میں کوئی فرق آتا ہے نہ ہمیں اس کی تاویل کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر اگر ہم ایک مردے کی بات سن یا سمجھ نہ سکیں تو آخر اس مفر کی صورت اختیار کرتے ہوئے تاویل کی راہ کیوں سوچیں؟ اور قبر کا معاملہ تو اس سے بھی خاص ہے، قبر ایک مادی اور جسمانی چیز ہے۔ قبر کا لفظ بولنے سے فوراً ہر کوئی سمجھ جاتا ہے، اور ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے، تو پھر آخر اس قبر کو زمینی قبر ہی سمجھ لینے سے کیا پرہیز؟ مہمل استفسارین کے سوالات و اشکالات کا جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے نظریہ کی ایک بار پھر وضاحت کر دوں جو اس طرح ہے:

- ۱۔ قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے۔ یہی کچھ رسول اللہ اور صحابہ نے بھی کیا۔
- ۲۔ قبر کی کئی تعبیر، کاس سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ برنجی قبر ہے، مابعد کی پیداوار ہے جو قریط یا دوسری انتہا ہے اور یہ غالباً شرک کے اس چھو دروازہ کو بند کرنے کے لیے اعتقاد کی گئی ہے۔
- ۳۔ مرنے کے بعد روح کو نیا جسم مقرر نہیں ہوتا بلکہ روح کا اپنا بھی جسم اور شکل ہوتی ہے اور یہ اس دنیوی زندگی میں بھی ہے۔ خواب میں ہی شکل و صورت ہوتی ہے اور یہ شکل و صورت

مرحلہ میں بھی تھی۔ اور اس کی شکل و صورت انسان کے ظاہری جسم کی شکل و صورت جیسی ہی ہوتی ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے زیتون کے درخت میں زیتون کا تیل یا کوئلہ میں جلنے والی گیس یا آگ۔

۴۔ مرنے کے فوراً بعد ہی رُوح کو عذاب و ثواب سے دوچار ہونا پڑتا ہے خواہ ابھی مرنے کا وقت نہ ہوا ہو اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

۵۔ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردہ کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکا ہے۔ اس وقت اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی چاپ بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطرابی امور ہیں۔ ان میں استغناء یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرصیب ہی نہ ہوا ان پر یہ واردات صرف روح پر ہی واقع ہوتے ہیں۔

۶۔ کبھی کبھار اس رُوح کے عذاب و ثواب کا ضعیف سا اثر اس جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے جو قبر میں دفن ہوتا ہے (اگر ہو تو) جیسا کہ خواب میں انسان کی رُوح کو رنج و راحت سے متاثر ہوتی ہی ہے، لیکن کبھی کبھار اس کا اثر انسان کے بستر پر پڑے ہوئے جسم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح سونے والے شخص کے خواب میں دنیا اور جہان اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتے ہیں اور وہ جاگنے والوں کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے اسی طرح مرنے والے انسان کی بھی دنیا جہان، اس موجودہ دنیا جہان سے الگ ہوتی ہے اور وہ ان کے اعمال و حرکات اور آواز سے قطعاً بے خبر ہوتا ہے لہذا قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ مُردے جو قبروں میں مدفون ہیں اور اسی طرح ان کی روحیں بھی، ہم دنیا والوں کی آواز یا فریاد قطعاً سن نہیں سکتے اور اس میں استثناء یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو کسی کو سنا بھی سکتا ہے۔

۸۔ ایسے سوالات یا اشکالات، کہ خواب میں ایک انسان کی رُوح کسی مرنے والے کے رُوح کی رُوح یا زندہ کی رُوح سے ملتی ہے؟ ان کا حل تلاش کرنا انسانی عقل سے ماوراء ہے۔ ان کے پیچھے پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں نہ ہی ایسی باتوں کا عقائد سے کچھ تعلق ہے۔

۹۔ رسول اللہ پر جہاں انہیں سے بھی دُور پڑھا جائے وہ فرشتوں کے ذریعہ ان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ عالم بذخ فی الحقیقت موت کا عالم ہے فیونکہ اس میں رُوح اور جسم کا انصال ہوتا ہے لیکن اس میں بھی استثنائی صورت موجود ہے تاہم اس میں موت کے اثرات ہی غالب رہتے ہیں۔ جس طرح اس دنیا میں، جو کہ عالم حیات ہے، استثنائی صورت خواب ہے اور اس خواب میں حیات کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم علماً اتم و سکرہ حکم



ڈاکٹر عثمانی صاحب کے دلائل کا جائزہ

مراسلات

(۲)

متعلقہ

روح، مقامِ قبر اور سماعِ موتی

(یہ جوابات محدث کی دو قسطیں بریح الاول اور بریح الآخر ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)  
محدث جون ۱۹۸۴ء میں 'مراسلات' کے عنوان سے میرا جو مضمون شائع ہوا تھا، اس سے متعلق دو حضرات کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں ایک تو وہی پرانے کو مفرما جناب سومر و صاحب ہیں اور دوسرے اشفاق صاحب ناظم آباد کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب سومر و صاحب نے کیپٹن مسعود الدین عثمانی صاحب کا پورا لٹریچر بھی مجھے مطالعہ کے لیے بھیج دیا ہے اور استدعا کی ہے کہ میں اس کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے آگاہ کر دوں۔ عثمانی صاحب کا لٹریچر تو میں پہلے بھی سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ اب نظر ثانی کا موقع مل گیا۔ جبکہ اشفاق صاحب کا خط خاصا طویل ہے۔ اسے خط کے بجائے عقاب نامہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ حضرت عثمانی صاحب کے نہایت شدید اتنی اور ان کے مخصوص نظریات میں عثمانی صاحب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتے ہیں۔ خط کا لب و لہجہ نہایت تند و تیز ہے۔ ہر وہ محدث، امام یا عالم حدیث جو انھیں اپنے مخصوص نظریات کے غلام نظر آیا، کھلے دل سے اور تحقوک کے حساب سے انہیں بدعقیدہ، گمراہ اور کافر و مشرک قرار دے دیا ہے۔

علمی مسائل کی تحقیق میں یہ انداز قطعاً غیر مناسب ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف

ہو جانا ایک فطری امر ہے، لیکن جب اس میں اس قسم کا تشدد تعصب پیدا ہو جائے تو یہ چیز امت میں اختلاف اور تفرقہ بازی کی بنیاد بن جاتی ہے جسے قرآن نے شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ اشفاق صاحب کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ جس جرم کی پاداش میں وہ دوسروں کو کافر و مشرک قرار دے رہے ہیں، خود انہیں اس سے بڑے جرم کا ارتکاب تو نہیں کر رہے ہیں؛ بالخصوص اس صورت میں جبکہ رسول اللہ کا یہ واضح ارشاد موجود ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے، تو اگر وہ کافر نہیں تو کھٹے والا ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ لہذا تحفیر بازی سے سختی الوسع پر مہیز لازم ہے۔

اب قرآن کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کا کھلا ہوا مشرک۔ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنا اور عیسائیوں کا تین خداؤں کا عقیدہ رکھنا۔ بیان کرنے کے باوجود انہیں مشرک نہیں کہا بلکہ اکثر مقامات پر اہل کتاب ہی کہا ہے۔ لہذا میں اشفاق صاحب کی بجائے عثمانی صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے ملتبعین کو ہدایت کریں کہ علمی مسائل کی تحقیق میں فرو تر باتوں پر اتر آنے کے بجائے علمی انداز ہی اختیار کیا کریں۔

اشفاق صاحب کے اس طویل خط میں تمام کے تمام اقتباسات عثمانی صاحب کے لٹریچر ہی سے دیے گئے ہیں۔ لہذا ہم اس خط کو بعینہ چھاپ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف قارئین کو عثمانی صاحب کے لٹریچر کا غلام معلوم ہو جائے گا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ حضرات ان نظریات کے مخالفین کے لیے کسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ خط بحسنہ درج ذیل ہے:

**اشفاق صاحب کا عتاب نامہ:**

مکرمی و محترمی مولانا عبد الرحمن بھیلانی صاحب السلام علیکم۔

محدث جون ۱۹۸۴ء کے شمارے میں مراسلات کے عنوان سے آپ نے رُوح، عذاب قبر اور سماع موتی سے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس میں چند باتیں میرے فہم سے بالاتر ہیں۔ (اسید ہے کہ آپ اگلی اشاعت میں میرے ان اشکالات کا واضح جواب شائع فرمائیں گے۔ مشکور ہوں گا۔)

۱۔ دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد ہی کو ڈھالی ہے جو صحیح

نہیں۔ دراصل ہر مرنے والے کو قرآن کے فرمان کے مطابق (شَعْرًا مَاتًا، فَأَقْبَرُہُ) قبر ملتی ہے۔ چاہے اس کو پھیلیاں ہی ہڑپ کر گئی ہوں۔ یہی اصل قبر ہے جہاں روح کو دوسرے برزخی جسم میں ڈال کر قیامت تک رکھا جائے گا۔ اور اس پر راحت یا عذاب کا پورا زمانہ گزرے گا۔

بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵ میں یہ روایت موجود ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن ابی النحر اجمی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنٹوں کو بھینچ رہا تھا۔ اسی طرح بخاری ج ۱ ص ۱۸۵ میں سمیرہ بن جندب کی طویل روایت موجود ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ روحوں کو جسم برزخی ملتا ہے اور روح اور اس برزخی جسم کے مجموعے پر راحت و عذاب ہوتا رہے گا۔ یہ عذاب کا سلسلہ تا قیامت چلے گا۔ یہ برزخی جسم ایسا ہے کہ اگر اس کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ پھر بن جاتا ہے۔ دنیا میں زنا کاروں کی قبریں مختلف ملکوں میں ہوتی ہیں مگر برزخ میں ان کو ایک ہی نور میں برہنہ حالت میں جمع کر کے آگ کا عذاب دیا جاتا ہے، اسی طرح بخاری جلد ۱ ص ۸۴ پر برابر بن عزیب سے روایت موجود ہے کہ جب ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تو رسولؐ نے فرمایا کہ ان کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی ہے۔ اسی طرح شہداء کے لیے سکم جلد ۲ ص ۱۳۵ میں روایت عبد اللہ بن مسعودؓ سے آئی ہے کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز اڑنے والے قابلوں میں ہیں۔ اور ان کے لیے قندیلیں عرش الہی سے لٹکی ہوئی ہیں۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء، عام مومن، کافر، مشرک سب ہی کو ایک برزخی جسم ملا ہے اور وہی اس کے لیے برزخی قبر ہے عذاب اور ثواب کا سارا معاملہ اسی برزخی جسم کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ گدھا جس کو غلطی سے آپؐ نے بھی قبر کا نام دے دیا ہے اور نہ اس عنصری جسم کو عذاب اور ثواب سے کوئی تعلق۔

آپؐ نے اس گڑھے کو قبر ثابت کرنے کے لیے جو چند احادیث تحسیر فرمائی ہیں ان کا جواب یہ ہے:

قبروں پر ٹھنڈیاں لگانے سے متعلق بخاری کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس کا منہم یہ ہے کہ جس طرح ایک لکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور

تخت سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی لیے آپؐ نے شاخیں لگا کر برزخی عذاب سمجھا دیا۔ رہا یہ سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مردے دفن کیے گئے تھے ان پر برزخ میں یہ حالات گزر رہے ہیں۔ یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اس حدیث کی آپؐ نے من مانی تشریح کر کے یہ بات نکال لی کہ انہی دنیاوی قبروں میں دنیاوی جسموں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ بڑی گستاخی ہے اور نبیؐ پر کتاب اللہ کے جھٹلانے کا غلط الزام ہے۔

نبیؐ کو کتاب اللہ کی تشریح اور تائید کے لیے بھیجا گیا تھا جھٹلانے کے لیے تو نہیں۔

اسی طرح بعض لوگ مسلم کی ایک روایت پیش کرتے ہیں جس میں قبروں کے پاس سے گزرتے ہوئے نبیؐ کا پتھر بدکا۔ اور اس سے یہ دلیل نکالی جاتی ہے کہ شترکوں پر ان ہی دنیاوی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے جس کی صحیح و پکار کو سن کر پتھر بدکا۔ خدا را سوچئے، کتنے پتھر، گھوڑے، گدھے آج بھی قبرستانوں میں ٹھوسے رہتے ہیں ایک بھی نہیں بدکا۔ دراصل یہ نبیؐ کا معجزہ تھا۔ اور اس خاص واقعہ کے ذریعے نبیؐ نے کفار پر برزخی عذاب، جو ان کو برزخی قبر اور برزخی جسم میں دیا جا رہا تھا، صحابہ کرامؓ کے ذہنوں میں محفوظ فرما دیا۔ مسلم کی ایک روایت جو جلد ۱ ص ۳۹ پر موجود ہے جس میں نبیؐ نے قبر پر نماز ادا فرمائی۔ بخاری کے حوالے سے آپؐ نے جس کو ان ہی دنیاوی قبروں کے لیے دلیل بنایا۔ آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ یہ قبریں اپنے اہل پراندھیروں سے بھری رہتی ہیں۔ میری دعا سے اللہ تعالیٰ انہیں متورخ و دیتا ہے۔ اگر اس روایت سے جیسا کہ آپؐ نے سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے دنیاوی قبر مراد لی جائے تو ایک ایک قبر میں بے حساب مردے دفن ہوتے ہیں کوئی اچھا کوئی بُرا ہر ایک کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا۔ اس کے بجائے اصل سچائی یعنی برزخ کی قبر مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس گڑھے کو قبر اور اس میں سوال جواب کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے

مسلم کے حوالے سے عربین عاصی کی مرتے وقت وصیت پیش کی جاتی ہے۔ اقول آ  
مسلم کی اس روایت پر امام نووی نے جرح کی ہے کہ اس کی سند اور اس کے متن میں  
کلام کیا گیا ہے۔ دیکھیے شرح مسلم نووی ج ۱ ص ۷۶۔ مزید یہ کہ اس کے راوی  
ابو امام صناعہ ابن عقیل کتاب الضعفاء میں لائے ہیں۔ دیکھیے الضعفاء۔  
للعقيلي ص ۱۷۱۔ میزان اعتماد جلد ۲ ص ۲۲۵

دوسرے یہ کہ یہ سکرانہ الموت کی بات ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ”وہو  
فی سياق الموت“ ایسے وقت کی بات ہے جب آدمی اپنے آپے میں نہ ہو۔  
قرآن اور حدیث کے کیسے بھٹکا یا جاسکتا ہے۔ آخر بزرگ واقعہ قرطاس کہ  
کیوں بھول جاتے ہیں؟ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ  
پر مرض کی شدت کی وجہ سے بحرانی کیفیت طاری ہے۔ اسی کے زیر اثر آپ یہ  
فرما رہے ہیں، اس لیے لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ اسی ذیل میں لوگ بریدہؓ  
کی وصیت پیش کرتے ہیں جو بخاری جلد ۱ ص ۱۸۱ پر موجود ہے۔ یہ بھی ان کی وصیت  
ہے۔ جس کا کیا اعتبار؟ جسے آپ نے ماہصل کے ذیل ص ۵ صفحہ ۲۱۶ میں تحریر  
فرمایا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی فرشتے مُردے کی رُوح کو آسمانوں کی طرف لے  
جاتے ہیں، پھر اس وقت واپس لاتے ہیں جب مُردہ قبر میں دفن ہو چکا ہے۔ اس  
وقت اس سے سوال اور جواب ہوتے ہیں اور وہ جانے والے آدمیوں کے جوتوں کی  
چاپ بھی سنتا ہے اور یہ سب اضطرابی امور ہیں۔ ان میں استثناء یہ ہے کہ جن لوگوں  
کو قبر نصیب نہ ہو ان پر یہ واردات صرف رُوح پر ہی واقع ہوتے ہیں، گویا کہ آپ  
بھی رُوح والی روایتوں کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ روایتیں سنداً  
ضعیف اور نص قرآنی کا انکار کرتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءِ  
آپ کے عقیدے کے مطابق مُردہ کے دفن ہوتے ہی رُوح واپس آ جاتی ہے۔  
گویا مُردہ مُردہ نہ رہا۔ قبر میں پھر زندہ ہو گیا جو قرآن کے خلاف ہے۔ پھر یہ  
رُوح آخر دوبارہ واپس گئی بھی یا نہیں؟ اگر آسمانوں میں اوپر واپس چلی گئی تو اس  
کے لیے آپ کے پاس حدیث کی کوئی دلیل ہے؟ دراصل یہ فتنہ نیا فتنہ نہیں  
بلکہ اس کے بانی مہاتی احمد بن منبل ہیں جو رُوح کے قائل ہیں۔ جیسا کہ کتاب الصلوٰۃ



۲۵ جع قاہرہ میں تحریر ہے :

”پھر ارواح کے قبروں میں جموں کے طرف لوٹائے جانے پر ایمان لانا

مزدوری ہے“

ان الفاظ کو پڑھیے اور احمد بن حنبل کی بدعتیہ کی پر سر دھنیے۔ اب بتائیے کون شخص احمد بن حنبل کو مسلمان سمجھ سکتا ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے ہی اس بدعتیہ کی کو معاشرہ میں رائج کیا اور امت مسلمہ آج تک جس کی سزا بھگت رہی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مرنے کے بعد صرف قیامت کے دن ہی انسان زندہ ہوگا۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ أَنْتُمْ أَيُّومَ الْقِيَامَةِ تَبْعَثُونَ۔ سورة المؤمنون ۱۵، ۱۶ اسی طرح سورة البقرة ۲۸  
كَيْفَ تَكْفُرُونَ يَا لِلّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ تُمَيِّتُكُمْ  
ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔

اسی طرح سورة المؤمن پک مل میں ہے۔ قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا أَفَلْنَمُوتُ  
وَأَحْيَيْنَا أَفَلْنَمُوتُ فَاغْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ  
مِّنْ سَبِيلٍ۔

محترم سوچئیے دوزندگیوں اور دو موتوں کے بعد تیسری زندگی اور تیسری موت کہاں سے آئی؟ آپ نے تو قبر میں روح چلا کر ایک تیسری زندگی کا جواز نکال دیا۔ جو کھلا قرآن کا انکار ہے۔

اس تضاد کو دور کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر روح کو ایک برزخی جسم ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔ مگر یہ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جانے والے آدمیوں کے جو توں کی چاپ بھی سنتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ دراصل یہ چاپ آدمیوں کی نہیں بلکہ فرشتوں کی ہوتی ہے جیسا کہ بخاری کے شارح ابن المنیر کی شرح ہے جس کو ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لائے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے :

ابن جریر مستطانی نے کہا کہ بخاری کے اس باب باندھنے کے (المیت یسمع قروح النعال - یعنی مردہ جو تلوں کی چاپ سنتا ہے) کے متعلق الزین بن المنیر نے کہا کہ مصنف (بخاری) کے اس مضمون کے باب باندھنے سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اس طریقہ کو آداب دفن میں اولیت حاصل ہے۔ کہ وقار برقرار رکھا جائے۔ شور و شر سے اجتناب کیا جائے۔ اور شدت کے ساتھ پیروں کو نہ مارا جائے۔ جیسے کہ ایک زندہ سونے والے کے لیے ہونا چاہیے اور ایسا لگتا ہے کہ بخاری نے (نبی کے الفاظ سے) یہ نکالا ہے کہ آدمیوں سے جیسا کچھ سنا جاتا ہے ویسا ہی فرشتوں سے بھی سنا جاتا ہے۔ (یعنی اُن کے جو تلوں کی آواز)

شاید آپ کا دوسروں کی طرح یہ عقیدہ بھی ہے کہ رُوحیں علیین اور سجنین میں رہتی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ علیین اور سجنین رُوحوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ نیکیوں کا رول اور بدکاروں کے اعمال ناموں کے دفتر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَمَا أَذْرَاكَ مَا يَسْجُدُونَ كِتَابٌ مَرْقُومٌ وَنِيلٌ يُؤْمِنُونَ لِّلْمَكِيدِ بَيْنَهُ سُوْرَةُ الْمَطْفِفِينَ (آیت ۹۸، ۹۹)، اور كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الذِّكْرِ أَتَىٰ عَلَىٰ يَئِيسٍ سُوْرَةُ الْمَطْفِفِينَ وَمَا أَذْرَاكَ مَا عَلَتِ يَوْنُ كِتَابٌ مَرْقُومٌ يَشْرَهُ الْمُقَرَّبُونَ۔ صرف یہی نہیں بلکہ گمراہ لوگ سورۃ اعراف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ ”ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات جھٹلاتے ہیں اور ان سے استکبار کرتے ہیں آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے“ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن کی ادیبانہ زبان ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال ان کی دُمائیں اور خود ان کی ہرگز پذیرائی نہ ہوگی۔ ایک دلیل کلام الہیت علی الجنازۃ کی بھی پیش کی جاتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مردہ ہے۔ زندہ تو نہیں بہر حال اس کا بولنا قرآن کے متشابہات کی طرح ہے۔ اور اس حدیث کی اصل تاویل کسی کے پاس نہیں ورنہ اگر کاندھے کے پاس ہولے تو اٹھانے والا کیوں نہ سنے گا۔ ہم نے آپ کے مضمون کے پیش کردہ دلائل کا بھی تجزیہ کیا۔ اور ان دلائل کی بھی اصل حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی۔ جو اس ذیل میں بار بار پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اب آپ کا فرض ہے کہ یا تو آپ رجوع فرما لیجئے یا پھر ہمیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطمئن کرنے کی کوشش کیجئے۔

امام احمد، امام ابن القیم، امام ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر اور ایک جم غفیر ہے۔ جو مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے رُوح کے واپس آ جانے کا قائل اور اسی دنیاوی قبر میں قیامت تک مُردہ پر عذاب یا راحت کے سارے احوال گزرنے کا اقرار ہی ہے۔ دراصل یہی عقیدہ ان سب بڑوں کو کافر اور مشرک بناتا ہے اور دائرۃ اسلام سے خارج کر دیتا ہے دوسری طرف قرآن اور احادیث صحیحہ اجماع صحابہ امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ ہیں جن کا فیصلہ یہ ہے کہ رُوح بدن سے نکلنے کے بعد مُردہ جسم میں قیامت سے پہلے واپس نہیں آ سکتی ہے۔

اور نہ دنیاوی جسم سے اس کا لمبی قسم کا تعلق باقی رہتا ہے اور یہ قبر کے مُردے بالکل مُردہ ہیں، ان میں جان کی رمق تک نہیں ہوتی۔

امت کی بد نصیبی ہے کہ آج کیفیت عذاب قبر کے اس عظیم مسئلہ کو فردعی مسئلہ قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایمان یا شکیانہ بالکتاب اور ایمان یا لرسول کا معاملہ ہے۔ جو بھی یہ عقیدہ رکھے کہ دنیاوی قبر کے مُردے میں رُوح واپس آ جاتی ہے۔ اسی کو اٹھا کر بٹھایا جاتا ہے۔ سوال اور جواب جوتا ہے۔ اور اب اسی پر قیامت تک دنیاوی قبر میں راحت کا دور جاری رہے گا۔ وہ ایمان سے خالی ہے۔

امید ہے کہ پہلی فرصت میں آپ زحمت فرماتے ہوئے تفصیلی جواب سے مطلع فرمائیں گے۔  
(والسلام) (اشفاق)

## جوابات

اس خط کے لب و لہجہ سے ہٹ کر اگر خالص علمی محاسبہ کیا جائے تو میرے خیال میں اختلافی مسائل صرت دو ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱۔ قبر کا صحیح مقام کونسا ہے؟ زمینی گودھا، جس میں ریت کو دفن کیا جاتا ہے یا برنجی قبر۔

۲۔ سماج موتی میں کوئی استثناء بھی ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کسی نہ کسی وقت عاودۃ رُوح کا امکان ہے یا نہیں؟

میں اس بحث میں خاص اختصار پیدا کرنے کی خاطر یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث

کو صرف قرآن کریم اور بخاری شریف تک محدود رکھوں۔

## (۱) مقامِ قبر؟

مقامِ قبر کے متعلق آپ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ مقام، جہاں میت کو عذاب و ثواب ہوتا ہے، یہ زمینی ٹکڑھا نہیں بلکہ کوئی برزخی مقام ہے جسے آپ برزخی قبر کہتے ہیں۔ یا برزخی قبر سے وہ نیا جسم مراد ہے جو میت کی روح کو مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظریہ کا کتاب و سنت میں بھی ذکر نہیں صرف استنباطات کے ذریعے لے کر شیعہ کیا گیا ہے۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ بخلاف عقیدہ کے کہ اس کی بنیاد قطعی نصوص شرعیہ یا بالفائدہ دیگر کتاب و سنت کے واضح الفاظ پر ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی سامنے رکھیے کہ نظریہ وہ ہوتا ہے جس کی صحت کو مختلف نتائج یا استنباطات کے ذریعے جانچا جاتا ہے جبکہ عقیدہ وہ ہوتا ہے جس کی اپنی حیثیت مسلم اور برقرار ہوتی ہے اور اس سے مختلف نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

برزخی قبر محض ایک نظریہ ہے!

اب دیکھیے "برزخی قبر" کا ثبوت قرآن یا کسی صحیح حدیث سے ملنا تو درکنار علمائے معتدین کی کسی تصنیف میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ لہذا یہ محض ایک نظریہ ہے عقیدہ نہیں۔ پھر اس نظریہ کے زمانے کی وجہ سے کسی کو بدعتیہ، اگر وہ یا مشرک و کافر بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ اشفاق صاحب نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ، "دوسرے گمراہ لوگوں کی طرح آپ نے بھی قبر سے مراد یہی گدھا لیا ہے جو صحیح نہیں" (آپ کا خط ص ۱)

اور عجیب بات یہ ہے کہ خود اشفاق صاحب کو بھی اس برزخی قبر کے محض ایک نظریہ ہونے کا اعتراف ہے۔ چنانچہ وہ اس خط کے ص ۴ پر لکھتے ہیں:

"اس کے بجائے اصلی سچائی یعنی برزخ کی قربان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اشفاق صاحب کے یہ الفاظ ہمارے دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں کیونکہ اگر یہ "اصل سچائی" کتاب و سنت میں مذکور ہوتی تو آپ کو اس کے مان لینے کے لیے ایسی التجا کرنے کی ضرورت

پھر اسی خط کے ص ۶ پر یوں رقمطراز ہیں:

”اس تضاد (یعنی اشتقاق صاحب کا اپنا ذہنی تضاد، جس کا آگے چل کر جواب دے دیا گیا ہے) کا واحد حل یہی ہے کہ مان لیا جائے کہ ہر رُوح کو برزخی جسم ملتا ہے اور وہی اس کی برزخی قبر ہوتی ہے۔ عذاب و ثواب کے تمام احوال اسی پر گزرتے ہیں۔ سوال و جواب بھی برزخی جسم اور برزخی قبر کے اندر ہوتا ہے۔“

اشتقاق صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اس ”اصل سچائی کو مان لیا جائے تو پھر کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس ”اصل سچائی کو ماننے سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میت کو مرنے کے ساتھ ہی ایک نیا جسم مل گیا، جو کم از کم یوم البعث تک قائم و دائم اور عذاب و ثواب سے دوچار رہے گا۔ تو اس رُوح اور جسم کے انفصال ہی کا نام تو زندگی ہے۔ آخر یہ مستقل اور دائمی زندگی کہاں سے آگئی؟ جبکہ قرآن میں صرف زندگیوں کا ذکر آیا ہے؛ اسی طرح اس مستقل اور دائمی زندگی میں مسلسل عذاب کا نظریہ بھی درست نہیں۔ قرآن میں تو اس برزخ کے عرصہ میں فرعون اور آل فرعون جیسے کافروں کے لیے بھیہم الکفار یُعَذِّبُونَا عَلَیْہِمَا عَذَابٌ وَاعِدٌ لَّہُمْ فَاذْعَبُوا“ کے الفاظ آتے ہیں جو عذاب کے تسلسل کو ختم کر دیتے ہیں۔ لہذا یہ نظریہ صحیح کیسے ہوا؟

برزخی جسم:

اس کے بجائے ہمارا نقطہ نظریہ ہے کہ رُوح کو کوئی نیا جسم نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا اپنا بھی جسم ہوتا ہے۔ فرشتے جب کسی مرنے والے کی رُوح کو نکالتے ہیں تو یہ رُوح اپنی جسمیت سمیت مادی جسم کے بند بند سے نکلتی ہے۔ پھر فرشتے اسی جسمیت سمیت رُوح کو کپڑے میں لپیٹ کر آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور رُوح کا یہ جسم مادی جسم میں اسی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے، جیسے کہ وہ میں جلنے والی گیس یا زیون کے درخت میں روغن زیون۔ رُوح کا یہ جسم مرحلہ ۱ میں بھی موجود تھا۔ جب ”السُّنَّتِ بِرُوحِکُمْ“ کا سوال و جواب ہوا۔ مرحلہ ۲ میں، مثلاً میں اور ۲ میں، یعنی غرض ہر مرحلہ پر رُوح کا جسم اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ البتہ مرحلہ ۲ اور ۳ میں اسے ایک اضافی مادی جسم بھی ملتا ہے اور اسی اضافی جسم کی وجہ سے ان ہر دو ادوار کو زندگی کے ادوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رُوح کے اسی اپنے جسم کی وجہ سے ہم خواب میں ایک

دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح رُوح کا یہی جسم خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہوتا ہے، اسی طرح حرمہ برزخ میں یہی جسم عذاب و ثواب سے دوچار ہوگا۔ رُوح کے اس جسم کو آپ نیا برزخی جسم کہہ لیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ ورنہ رُوح کا اپنا مستقل جسم ہوتا ہے۔ جس کا حرمہ برزخ سے چندان تعلق نہیں۔

رُوح کا یہ جسم سستا بھی ہے اور بولتا بھی ہے۔ لیکن اس کا یہ بولنا اور سننا ہمارے لیے بے کار ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں جو کچھ کہتا یا سنتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے جاگنے والے شخص کو اس کی گفت و شنید کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان دونوں کا عالم بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔

پھر جس طرح خواب میں کوئی شخص انتہائی تکلیف یا انتہائی انبساط میں ہوتا ہے تو اس کے اثرات کبھی دفعہ بستر پر لیٹے ہوئے جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح حرمہ برزخ میں عذاب و ثواب سے دوچار ہونے والی رُوح پر جب شدت گزرتی ہے تو اس کے اثرات قبر میں پڑے ہوئے جسم تک بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ جسم موجود ہو تو، ورنہ نہیں۔ گویا استثنائی صورت میں ہیں، مگر ان سے انکار ممکن نہیں۔ عام قانون یہی ہے کہ جس طرح خواب دیکھنے والے شخص کے رنج و راحت سے اس کا بستر پر پڑا ہوا جسم دوچار نہیں ہوتا، اسی طرح برزخ میں رُوح اور جسم پر جو واردات گزرتے ہیں قبر میں پڑا ہوا جسم اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

**کیا علیتین اور سجتین برزخی مقام ہیں؟**

اشفاق صاحب اور اسی طرح عثمانی صاحب کا خیال ہے کہ علیتین اور سجتین برزخی مقامات نہیں بلکہ وہ صرف رجسٹر ہیں جن میں اہل جنت اور اہل النار کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ جہاں علیتین اور سجتین کا ذکر آیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب مرقوم کے الفاظ سے علیتین اور سجتین کی صفت بیان کی گئی ہے۔ لہذا برزخی مقام دراصل رُوح کا وہ نیا جسم ہی ہے جو اسے مرنے کے ساتھ ہی عطا کیا جاتا ہے۔

ہمیں اس نظریہ سے بھی اختلاف ہے کیونکہ جہاں کہیں بھی یہ رجسٹر اندراجات ہوں گے وہ کوئی مقام ہی ہوگا۔ پھر جہاں قرآن میں علیتین کا ذکر آیا ہے۔ وہاں

”کِتَابٌ مَرْکُومٌ“ کے۔ اھ ”یُشْمِدُ الْمُقَرَّبُونَ“ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔  
 یعنی جس مقام پر اہل جنت کا یہ رحبڑ ہے، وہاں مقرب لوگ (مرے ہوئے نیک لوگ  
 یا مقرب فرشتے) بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں تعین کا ذکر آیا ہے وہاں  
 ”کِتَابٌ مَرْکُومٌ“ کے ساتھ ہی ”وَنِدْوٰی مَوْصِلٰہٖ لِلْمَلَائِکَہِ رَبِّیْنَ“ کے الفاظ بھی  
 آتے ہیں۔ یعنی اس اندراج کے دن ہی سے ان بھٹلانے والوں کی ہلاکت کا دور شروع  
 ہو جاتا ہے۔ اندر میں صورت حال عظیم اور تعین مقام نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ایسے  
 مقامات ہیں جہاں صرت اہل جنت اور اہل النار کے نام ہی درج رحبڑ نہیں کیے جاتے،  
 بلکہ وہی مقام ان روحوں کا اصل مستقر بھی قرار پاتا ہے۔ اور انہی مقامات پر وہ عرصہ برزخ  
 میں عذاب و ثواب سے تاقیامت دوچار ہوتے رہیں گے۔

### قبر سے مراد یہی زمینی گڑھا ہے۔

میں نے اپنے سابقہ مضمون ”مراسلات“ میں قبر سے مراد اسی زمینی گڑھا ہونے  
 کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے سات دلائل دیے تھے جو یہ ہیں،  
 ۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو عبد اللہ بن ابی منافق کے متعلق خطاب کرتے ہوئے  
 فرمایا، ”وَلَا تَقْعُرْ عَلٰی قَبْرِہٖ“ اب خدا اسے بتا رہے کہ یہاں قبر سے مراد اللہ تعالیٰ  
 نے ہی زمینی گڑھا لیا تھا یا آپ کی مرحومہ برزخی قبر؟ نیز خود رسول اللہ اور آپ کے  
 صحابہؓ نے قبر کے لفظ سے یہ زمینی گڑھا مراد لیا تھا یا برزخی قبر؟ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ  
 کو اس منافق کی اس زمینی قبر پر کھڑا ہونے کو کیوں ناپسند کیا تھا؟  
 ۲۔ رسول اللہ کا مقتولین علیہ السلام کو وہاں پہنچ کر مخاطب کرنا۔ اگر یہ کنواں ان  
 مشرکین کی حقیقی قبر نہ تھا تو آپؐ وہاں گئے کیوں تھے؟ جہاں پہلے موجود تھے، وہیں  
 سے ان برزخی قبر والوں کو مخاطب کر لیا ہوتا؟

۳۔ رسول اللہ کا جنت البقیع میں جا کر شہداء کے اہد کے لیے دُعا کرنا اور  
 ۴۔ آپؐ کا قبرستان میں یعنی انہی زمینی گڑھوں کے پاس جا کر مردوں کو  
 ”السلام علیکم“ کہنا اور ان کے لیے دُعا کرنا۔ آخر آپؐ کھڑ بیٹھے ہی السلام علیکم  
 کیوں نہیں کہہ لیتے؟ کیونکہ ان کا قبرستان سے تو کوئی تعلق ہے نہیں۔ وہ تو برزخی  
 قبروں میں رہتے ہیں۔

۵ تا ۷ - بخاری شریف سے تین امانتیں بمعہ متن، ترجمہ اور حوالہ جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ قبر سے مراد بھی زمینی گڑھا ہے، کو ہی ہم اصل سچائی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے مقابل برزخی قبر کا نظریہ مؤود قرار پاتے گا۔ اگرچہ ان حضرات کے نزدیک اس کے مضمومہ فوائد کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

### شاخوں والی حدیث کا نیا مطلب:

ان سات دلائل میں سے صرف ایک حدیث کا اشتقاق صاحب نے جواب دیا ہے اور وہ کرتے بھی کیا کہ اس پہلو سے عثمانی صاحب نے صرف ایک ہی حدیث کا جواب لٹریچر میں لکھا تھا (حدیث یہ تھی کہ:

”رسول اللہ بمعہ صحابہ کرام دو قبروں کے پاس سے گزرے۔ جن میں دو میتوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ تو آپؐ نے درخت کی شاخ چیر کر اُدھی ایک قبر پر اور دوسری اُدھی دوسری قبر پر گاڑ دی۔ اور صحابہ کرامؓ کے پوچھنے پر آپؐ نے یہ وضاحت فرمائی کہ جب تک یہ ٹہنیاں سوکھ نہ جائیں شاید ان کا مذاب کچھ ہلکا ہو جائے۔“  
اس کے جواب میں آپؐ نے لکھا ہے:

”اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ایک لیکچر دینے والا اپنی زبان سے ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور تختہ سیاہ پر اس کو لکھتا بھی جاتا ہے تاکہ کان سن کر اور آنکھیں دیکھ کر خوب یاد رکھیں۔ اسی طرح آپؐ نے شاخیں لگا کر سمجھا دیا۔ ہاں سوال کہ یہ شاخیں دنیاوی قبروں پر کیوں لگائیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ میں صحابہ کرامؓ کو لے جا کر ان کی اصلی قبروں پر لگانا ناممکن تھا۔ دراصل یہ بتانا تھا کہ ان قبروں میں جو مردے دفن کئے گئے تھے ان پر یہ حالات گزر رہے ہیں اور یہ نبی کا معجزہ تھا۔“  
سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ کیا تھا؟ نبیؐ کو بذریعہ وحی ایک بات کی اطلاع ملی تو آپؐ نے یہ اطلاع صحابہ کرامؓ کو بھی دے دی۔ اس میں معجزہ کی کیا بات ہے؟ انبیاء کی نبیئت کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہر ایسی بات، جس کا انہیں بذریعہ وحی علم ہوتا ہے، وہ امت کو پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح خیر بدکنے کی اصل وجہ بتلانا۔ یاد دھما کہ کی وجہ بتلانا جو انہیں بذریعہ وحی معلوم ہوتی ہیں، انہیں امت کو



بنانا ہی انبیاء کا کام ہوتا ہے۔ اس میں معجزہ کی ہولناکی ہے کم از کم ہم تو نہیں سمجھ سکے معجزہ تو جب ہوتا اگر صحابہ کرامؓ بھی اس مذاہب کو ہوتے دیکھتے یا سن لیتے۔ معجزہ ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو نبی دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور دوسرے لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ نبی کے بذریعہ وحی علم کو معجزہ کہنا کیسے درست سمجھا جاسکتا ہے؟

اور یہ تختہ سیاہ والی بات بھی خوب رہی۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو بھی پوری نہیں تو تم از قلم آدمی قبر آپؐ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ برزخی قبر کا تعلق سننے سنالنے سے ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھنے دکھانے اور لکھ کر بتانے کا تعلق ہے تو یہ کام اس زمینی گڑھے والے تختہ سیاہ ہی سے لیا جائے گا۔ پھر اگر بغرض تسلیم اس نظریہ برزخی قبر کو مان بھی لیں تو بھی اس سے اتنا تو بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اس برزخی قبر سے اس زمینی گڑھے کا کچھ نہ کچھ تعلق ہے ضرور۔ جہاں تا کہ عذاب قبر سے متعلق باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ اور یہی کچھ ہم سمجھتے ہیں!

### برزخی قبر کے نظریہ کا استنباط:

اس نظریہ کا استنباط یوں کیا گیا ہے کہ قرآن میں ہے ”ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ“ یعنی ہر شخص کو مرنے کے بعد قبر ملتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو یہ تسر میسر نہیں آتی۔ کچھ لوگ ڈوب جاتے ہیں انہیں مچھلیاں ہڑپ کر جاتی ہیں۔ بعض دوسروں کو حلا کر راکھ بنا دیا جاتا ہے۔ تو انہیں قبر کہاں ملی؟ جبکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ ہر شخص کو قبر ملتی ہے۔ لہذا ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے“ کے تحت برزخی قبر کا نظریہ قائم کیا گیا۔ برزخ کا لفظ بھی قرآن کریم میں ایک دو بار آیا ہے اور قبر کا لفظ تو بہت مقامات پر آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے ملانے سے برزخی قبر کی اصطلاح بن گئی۔ اب اگر یہ نظریہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہوتا تو تم از قلم الفاذ تو قرآنی ضرور ہیں۔

اور اس نظریہ کو اپنانے کی وجہ یہ بنی کہ حضرات اس سنت الہی کہ ”مرنے کے بعد ایسے قبر دی“ میں کمی استثنائے قائل نہیں۔ حالانکہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کوئی سنت الہی ایسی نہیں جس میں استثناء نہ ہو۔ قرآن میں صرف ایک سنت الہی

کے متعلق چار مقامات پر آیا ہے کہ "فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا.... وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا" اور وہ سنتِ الہی یہ ہے کہ جو قوم ایمان لائے میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کا عذاب ضرور آتا ہے۔ لیکن اس موثق سنت میں بھی اللہ تعالیٰ نے "إِلَّا قَوْمًا يَتُونُوا" فرما کر استثناء کی صورت پیدا کر دی ہے۔

اب دیکھیے سنتِ الہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو قبر ملتی ہے اور اس سے بھی زیادہ موثق سنتِ الہی یہ ہے کہ موت بھی صرف دو بار ہے۔ اور زندگی بھی دو بار۔ تو پھر جب اس موثق سنتِ الہی میں استثناء کی صورتیں قرآن سے ثابت ہیں۔ جیسے کہ میں اپنے مقالہ میں وضاحت سے پیش کر چکا ہوں۔ تو اس "مرنے کے بعد قبر ملنے کے" قانون میں استثنائی صورتوں کو تسلیم کرنے میں آخر کیا چیز مانع ہے؟ اور یہ استثنائی صورتیں یہ ہیں کہ کچھ لوگ دُوب کر مَر جاتے ہیں، بعض کو درندے پھاڑ کھاتے ہیں، کچھ دُوسروں کو جلادیا جاتا ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود عام اصول یہی ہے کہ مرنے والے کو اللہ تعالیٰ قبر دیتا ہے اور ابتدائے آدم سے انبیاء کی یہی تعلیم رہی ہے کہ مردوں کو قبر میں دفن کیا جائے۔ اور یہی چیز احترامِ انسانیت ہے۔ پھر اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ہر مرنے والے کو مرنے کے ساتھ ہی عذاب و ثواب قبر شروع ہو جاتا ہے اور عذاب و ثواب کے لیے رُوح کے ساتھ جسم ہونا لازمی ہے۔ پھر

جن لوگوں کا جسم ہی باقی نہ رہا ہو انہیں عذاب و ثواب کیونکر ہوگا؟ پھر قرآن میں فرعون کے ذکر میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کے جسم کو نجات دی جائے گی اور یہ بھی ہے کہ فرعون اور آل فرعون سب کو مرنے کے بعد عذاب پر پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تکلیف کیسے ممکن ہے؟ لہذا ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مرنے کے بعد رُوح کو ایک نیا بدن ملتا ہے۔ اور یہی جسم اس کی برزخی قبر ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں رُوح کو کبھی نئے جسم کی ضرورت نہیں۔ رُوح کا اپنا بھی ایک جسم ہے۔ جس کی تفصیل ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

## قبر کے نام مفہوم پر عثمانی صاحب کے اعتراضات

قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے پر عثمانی صاحب اور اسی طرح موجودہ دور کے بعض دیگر لوگوں کو مندرجہ ذیل قسم کے اعتراضات ہیں۔

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچہ ہوتا ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ ایک ہی قبر میں کئی مڑے دفن ہوتے ہیں۔ اب بتلانیے کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے یا ثواب؟

۲۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب منکر نکیر آتے ہیں تو مڑے کو قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ پھر مومن کے لیے یہ قبر کشادہ کی جاتی ہے حالانکہ اس زمینی گڑھے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لہذا ضروری ہے کہ اس سے برزخی قبر ہی مراد لی جاتے۔

۳۔ حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ستر ایسے زہریلے سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کو ڈس لے تو زمین سبزہ آگاہا ناچھوڑ دے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ زمین نے آج تک سبزہ آگاہا ناچھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینا درست نہیں۔

۴۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ قبر میں ظلمت سے بھری ہوتی ہیں۔ میری دعا سے وہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اب اگر ایک قبر میں نیک و بد دونوں قسم کے مڑے ہوں تو کیا صورت ہوگی؟ کیا ان سب کو اس نور سے فائدہ پہنچے گا؟

۵۔ زانیوں کی قبریں دنیا میں مختلف مقامات پر ہوتی ہیں لیکن رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ انہیں ایک ہی جگہ ایک تنور میں عذاب ہو رہا تھا وغیرہ۔

## اعتراضات کے جوابات

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کا جواب دراصل میں اپنے مقالہ میں دے چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے، ان حضرات نے اپنے مخصوص قسم کے نکات پر ہی نظر ڈالی۔ لہذا اب اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ فرض کیجئے ایک کمرے میں دو آدمی سو رہے ہیں، اور خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک تو خواب کی حالت میں پٹ رہا ہے لیکن دوسرا خواب ہی میں دھوئیں اٹا رہا ہے اور ایک تیسرا

آدمی ان دونوں کے پاس بیٹھا جاگ رہا ہے۔ اب دیکھئے یہ تینوں آدمی ایک دوسرے اور میسرے کے حالات سے قطعاً بے خبر ہیں کیونکہ تینوں کے عالم الگ الگ ہیں۔ اگرچہ ہمارے محسوسات کے لحاظ سے تینوں ایک ٹکڑے میں، ایک مقام پر اور ایک عالم نہ دنیا میں ہیں۔

عالم برزخ کا عقوڈ اہست تصور، جتنا کہ اس عالم دنیا میں ممکن ہے، خواب اور اس کے کوائف و واردات میں غور و فکر کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ نیند بھی زندگی اور موت کے درمیان برزخ ہے اور اسی لیے نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیند میں چونکہ زندگی کے آثار غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اس دور کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور برزخ میں چونکہ موت کے اثرات غالب ہوتے ہیں اس لیے قرآن نے اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار پائے جاتے ہیں اسی لیے اس موت کے دور کو برزخی زندگی بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

اس تصریح سے عثمانی صاحب کے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیا رومیوں کو ہیں ایک تو عذاب و ثواب جھگت رہی ہے اور دوسری دنیا میں اپنے قبر میں پڑے ہوئے جسم میں موجود ہوتی ہے تو کیا رومیوں میں وہ ہوتی ہیں؟ اگر اس دنیا میں اس طرح کی مدد رومیوں کے وجود کا امکان ہے تو اس دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ ایک روح سے کئی جسم میں ہوتی اور دوسری آسمانوں کی سیر کرتی پھرتی ہے۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں حدیث میں آیا ہے کہ بدکردار انسان کو ایسے زہریلے ستر سانپ ڈستے ہیں کہ اگر ان میں ایک سانپ زمین کو ڈس لے تو وہ سبزہ اگانا چھوڑ دے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ زمین نے سبزہ اگانا تو چھوڑا نہیں۔ لہذا قبر سے یہ زمینی گڑھا مراد لینا درست نہیں۔

یہ بھی عجیب قسم کی منطق ہے کہ سانپ ڈسے تو انسان کو اور سبزہ اگانا زمین چھوڑ دے وہ کیوں؟ آخر اس سانپ نے زمین کو تو ڈسا نہیں، پھر جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ عذاب و ثواب قبر کا بیشتر انحصار روح یا روح کے جسم پر ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شدت سے کبھی کبھار قبر میں پڑا ہوا جسد منصری بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ تو بدکردار انسان کے اس مذاق سے آخر زمین سبزہ اگانا کیوں چھوڑ دے؟

یہ اور اس قبیل کے دوسرے اعتراضات میں عام غلطی جو ہوتی ہے وہ ہے کہ بات تو کرتے ہیں روح اور عالم برزخ کی، اور اسے پرکھنا چاہتے ہیں انسانی عقل اور محسوسات

سے، حالانکہ یہ بات اصول غلط ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ روح کے متعلق انسان کو بہت محفوظ علم دیا گیا ہے۔ تو پھر اس عقوڑے علم کی بنیاد پر ایک نظریہ قائم کرنا، پھر اس نظریہ کو عقیدہ کارنگ دینا پھر اس میں اتنا تشدد اور متعصب ہو جانا کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف بات کرے اسے کافر و مشرک کے القاب دے ڈالنا، آخر یہ کس لاک کی دانشمندی ہے؟

شہداء اور عالم برزخ

شہداء کے متعلق قرآن کریم میں ایک جگہ تو یہ مذکور ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں۔ (البقرہ ۱۹۴) اور دوسری جگہ فرمایا کہ "اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو مردہ گمان بھی نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔" اور اعلیٰ سے ثابت ہے کہ شہداء کو سبز رنگ کے پندروں کا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ وہ جنت کے باغوں میں اہلہاتے، جنت کے میوے کھاتے اور عرش الہی کے نیچے لٹکتی ہوئی سنہری قندیلوں میں لہیرا کرتے ہیں۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۲۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخی زندگی تو سب ہی کو ملتی ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہر کوئی مذاب و ثواب سے بھی دوچار ہوتا ہے تو پھر شہداء کی خصوصیت کیا رہی؟ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ حرامان کہ انہیں مردہ نہ کہو یا نہ سمجھو محض ازراہ اعزاز ہے؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات محض ازراہ عزت و احترام نہیں۔ بلکہ وہ فی الحقیقت زندگی کے دور میں ہیں جیسا کہ قرآن میں دونوں مقامات پر بَيِّنَاتِ اَحْيَاء کے الفاظ آئے ہیں جبکہ باقی سب السالوٰں کے لیے "اَمْتَوَاتِ خَيْرًا اَحْيَاء" کے الفاظ آئے ہیں۔ اور شہداء کی تفضیلت یہ ہے کہ ان پر سے مرحلہ مٹ یعنی مرنے کے بعد سے لے کر یوم البعث تک کا دور۔ جسے برزخی زندگی بھی کہتے ہیں اور قرآن اسے موت کا دور بتلاتا ہے، یکسر اٹھایا جاتا ہے اور وہ مرحلہ مٹ یعنی دنیوی زندگی میں شہادت پاتے ہی فوراً سیدھے مرحلہ ۲ یعنی مکمل اور دائمی زندگی کے دور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان سے منکر حیر کے سوال و جواب نہیں ہوتے۔ قرآن کریم کے الفاظ "بَلَّ اَحْيَاء" کا یہی مطلب ہے جبکہ عثمانی صاحب شہداء کی برزخی زندگی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

”اس طرح سے صاف بتلا دیا گیا کہ شہداء اپنے رب کے پاس ہیں اور وہاں  
 رزق پارسہ ہے۔ ان قبروں کے اندر زندہ نہیں۔ ان کی زندگی برزخی  
 ہے دنیاوی نہیں“ (یہ قبریں یہ آستانے ص ۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ اگر شہداء کی زندگی بھی برزخی ہے اور عام انسانوں کی بھی،  
 تو عام انسانوں کے لیے اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ اور شہداء کو مَبْلُ اَحْيَاءٌ کیوں  
 کہا گیا؟

موت کے بعد شہداء اور عام انسانوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ شہداء کو  
 جنت میں سبز پرندوں کا جسم عطا ہوتا ہے اور یہ جسم حقیقی اور مستقل ہوتا ہے جبکہ  
 دوسروں کی رُوح کو ان کا اپنا ہی جسم یا بقول عثمانی صاحب نیا جسم عطا ہوتا ہے جو  
 ہر آن بنتا بگڑتا رہتا ہے۔

## ۲- اعادۂ رُوح اور عذاب قبر

اعادۂ رُوح کے متعلق بخفی بھی احادیث آتی ہیں، عثمانی صاحب نے ان کو  
 یا تو مخرج و موضوع قرار دیا ہے یا پھر ان کی کوئی نئی اور مضحکہ خیز تاویل پیش کر دی  
 ہے۔ اثبات اعادۂ رُوح کے موضوع پر ایک الگ مفصل بحث شائع ہو چکا ہے  
 جس میں عثمانی صاحب کی ان علمی تحقیقات کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا۔ سردست  
 ہم صرف بخاری کی اسی حدیث سے تعرض کریں گے جو موضوع زیر بحث میں اکثر  
 پیش کی جاتی ہے۔ پھر اس سے ممکنہ نتائج پر غور کریں گے۔ حضرت انس بن مالک  
 سے روایت ہے کہ :

”اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ  
 فِي قَبْرِهِ وَتَوَلَّى عَنْهُ اَصْحَابُهُ اِنَّهُ لَيَسْمَعُ قُرْعَ بَعَالِهِمْ  
 اَنَّهُ مَلَكٌ كَيْفَعَدَا اِنَّهُمْ فَيَقُولُوْنَ مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِي  
 هَذَا الرَّجُلِ لِمَحَمَّدٍ فَاَمَّا الْمُتَوَمِّنُ فَيَقُوْلُ اَشْهَدُ اَنَّ  
 عَبْدَ اللّٰهِ وَرَسُوْلَهُ فَيَقَالُ لَهُ اَنْظُرْ اِلَى مَقْعَدِكَ مِنَ  
 النَّارِ قَدْ اَبَدَ لَكَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ فَيَرَاهُمَا  
 جَمِيْعًا۔ قَالَ فَتَادُوْهُ وَذَكِّرُوْهُ اَنَّهُ لَيُفْسَحُ لَكَ فِي قَبْرِهِ ثُمَّ

رَجَعْنَا إِلَى حَدِيثِ أَنَسٍ قَالَ: وَأَمَّا الْمَنَافِقُ وَالْمُكَافِرُ فَيُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ فَيُقَالُ لَهُ لَا دَرِيَّةَ وَلَا تَلَيْتَ فَيُضْرَبُ بِمِطَارِقٍ مِنْ حَدِيدٍ صَوْبَهُ فَيُصَيِّحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ غَيْرُ الثَّقَلَيْنِ“ (بخاری، کتاب الجنائز۔ باب ما جاء في عذاب القبر)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، جب آدمی اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس لوٹتے ہیں تو بلاشبہ وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے (اسی وقت اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو اُسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں، ”تو اس شخص یعنی محمدؐ کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا تھا؟“ اب اگر وہ ایماندار ہے تو کہتا ہے، کہ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں“ پھر اس سے کہا جاتا ہے۔ ”تو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے اللہ تعالیٰ نے اس کے بدل تجھ کو جنت میں ٹھکانا دیا“ تو وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا۔ قتادہ کہتے ہیں ”اور ہم سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔“ پھر اس کی حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ”اور اگر وہ منافق یا کافر ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اس شخص کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتا ہے؟ تو وہ کہتا ہے۔ ”میں نہیں جانتا۔ میں تو وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔“ پھر اس سے کہا جاتے گا کہ نہ تو خود سمجھا اور نہ ہی خود پڑھا۔ اور لوہے کے ہنٹروں سے اسے ایسی مار پڑے گی کہ وہ بلبل اٹھے گا۔ اور اس کی ریختہ جنت و انسان کے سوا تمام آس پاس کی چیزیں سلتی ہیں“

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ بنیادی طور پر ”وَضَعَ“ کا لغوی معنی ”آمارنا اور نیچے رکھنا ہے۔ (مفردات لُغِیۃ) اور ”وَضَعَ فِي قَبْرِهِ“ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ قبر سے مراد یہی زمینی

گڑھا ہے۔ رُوح کو کسی برزخی جسم میں داخل کرنے کے لیے ”وَضِعَ“ کا لفظ استعمال نہیں ہوگا۔

۲۔ ”وَتَوَلَّی عَنْهُ اَصْحَابُہُ“ کے الفاظ سے بھی قبر سے مراد زمینی گڑھا ہے

کیونکہ میت کے ساتھی اسی زمینی قبر سے واپس جاتے ہیں نہ کہ برزخی قبر سے۔

۳۔ جنّ والنس کے سوا تمام اشیاء میت کے عذاب آؤد جکا کو سستی ہیں۔ جنّوں کے

متعلق ہم وثوق سے کہہ نہیں سکتے۔ لیکن انسان تو اسی زمین پر بستے ہیں اور مَعْنٰ

یَلْبِیْہِ کے الفاظ سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ اس قبر کے آس پاس کی اشیاء اور

جنّ والنس ہیں۔ اب انسان چونکہ اسی زمین کے پاس ہو سکتے ہیں۔ برزخی قبر کے پاس

نہیں ہوتے۔ لہذا قبر سے مراد ہی زمینی گڑھا ہے۔

”اِنَّہٗ لَیَسْمَعُ قَوْلَہٗ لِنَا لہِیْطُ“ (یعنی مُردہ ان واپس جانے والوں کے

جو توں کی آواز سنتا ہے) کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس

جسم میں رُوح بھی ہوتی ہے۔ جو موت کے وقت فرشتے نکال کر لے گئے تھے۔

اس سے اعادۂ رُوح کا اثبات ہوتا ہے۔ اب یہ سوال کہ رُوح فرشتے اپنے

ساتھ لاتے ہیں۔ یا یہ رُوح ان کی آمد سے پہلے لوٹائی جاتی ہے۔ اور پھر یہ رُوح

واپس کب اور کس طرح جاتی ہے؟ ایسے سوال ہیں جن کے جاننے کے ہم مکلف

نہیں ہیں۔ اور یہ سوال ایسے ہی ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ طیلیٰ مہین مردوں کو

زندہ کرتے تھے، وہ دوبارہ کب مرتے تھے؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ رُوح کا

اصل ٹھکانا یہ دنیاوی قبر نہیں ہے اور رُوح کی یہ واپسی ایک اضطراری امر اور

امتد کے حکم کے تحت ہے۔

۵۔ ”فَیُعْیْذُہٗ“ یعنی وہ دونوں فرشتے قبر میں لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا

دیتے ہیں۔ فرشتوں کے اس عمل سے بھی قبر کے زمینی گڑھا ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

کیونکہ برزخی قبر کو محض رُوح کو ایک نیا جسم ملنے کا نام ہے اور یہی نیا جسم اس کی

برزخی قبر ہے۔ اس برزخی قبر میں فرشتوں کے میت کو اٹھا کر بٹھلانے کا تصور ہی

کب پیدا ہوتا ہے؟

۶۔ ”قبر میں فرشتے لیٹی ہوئی میت کو اٹھا کر بٹھلا دیتے ہیں۔ نیز مومن کے لیے قبر

کھول دی جاتی ہے۔“ اس سے عثمانی صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ قبر کو اسی



وقت اکھاڑنے سے ہم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں دیکھتے۔ لہذا قبر سے مراد زمینی گودھا نہیں ہو سکتا اور اس سے مراد پس برزخی قبر ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اس سے بالکل دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قبر کی اندرونی دنیا، اس کی خارجی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ قبر میں رکھی ہوئی میت سے جو روایات و حوادث پیش آرہے ہوتے ہیں۔ اس سے قبر کو اکھاڑنے والا شخص کبھی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنے والا شخص اپنے خواب میں نہایت سستی خیز حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پاس بیٹھنے اور جاننے والے کو اس کا علم تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ دونوں اسی دنیا میں اور ایک ہی جگہ پر ہوتے ہیں۔ لہذا برزخی قبر کے نظریہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور یہ بات میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں کہ اس دنیا میں خواب میں رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے مادی جسم سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ لہذا اس پر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن قبر یا عالم برزخ میں اس رنج و راحت سے دوچار ہونے والی رُوح کا اپنے جسم سے تعلق نہایت کمزور اور کبھی کبھار ہوتا ہے۔ پھر یہ تعلق بھی رُوح کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہذا اس دور کو اَمَوَاتٌ غَیْبٌ اَحْیَاءٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں یہ روایت درج کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وَ قُبْرِہِیْ اَعَادَہُ رُوحُہِ کے قائل ہیں۔ پھر انہوں نے یہ روایت ایک ممتاز صحابی حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ بن مالکؓ بھی اَعَادَہُ رُوحُہِ کے قائل تھے۔ پھر درمیان میں جتنے حضرات سے اس کا سلسلہ سند منسلک ہے، یہ سب حضرات بھی اَعَادَہُ رُوحُہِ کے قائل تھے۔ پھر آخر امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، ابن کثیرؒ ابن حجرؒ اور ایک جیم غفرلہ کو نسا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ انہیں بدعتیہ، گمراہ، کافر و مشرک اور ایمان سے خالی وغیرہ وغیرہ القابات سے نوازتے ہیں؟ اب آپ کے مددِ حین میں سے ایک امام ابو حنیفہؒ رہ جاتے ہیں جن کے سوال و جواب کو غلط جابر پہنایا جا رہا ہے۔ جہاں تک رُوح کے قبر میں واپس آنے اور پھر ہر وقت موجود رہنے کا تعلق ہے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اصل سوال زیر بحث یہ ہے کہ کیا کسی وقت اعادۂ روح ممکن سمجھے یا نہیں، خواہ بعض استثنائی صورت میں ہی کیوں نہ ہو؟ اس سوال کے جواب میں کسی صحابی، امام بخاری یا امام ابو حنیفہؒ کا قول پیش فرمائیے۔ تو قطع نزاع کے لیے دلیل کا کام دے سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے واقعہ سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح قبر میں موجود نہیں ہوتی۔ بلکہ اہل قبورِ اَمْوَآتِ غَيْرُ اَحْيَاءِ ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کسی صحابیؒ، امام بخاریؒ یا امام ابو حنیفہؒ، بلکہ ان کے علاوہ علمائے معتدلیں میں سے کسی ایک کا نام بتلا سکتے ہیں جس نے قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا لینے کی بجائے آپ کی مرمومہ برزخی قبر لیا ہو؟

ہم نے یہاں بخاری سے صرف ایک حدیث عذابِ قبر سے متعلق درج کی ہے جبکہ دوسری کتب صحاح میں بھی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ پھر ایسی صحیح روایات کے علی الرغم ہم اس استثنائی صورت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اسی زمینی قبر میں فرشتے آتے ہیں تو میت کی رُوح واپس قبر میں لوٹائی جاتی ہے۔ اسی زمینی گڑھے میں فرشتے سوال و جواب کرتے ہیں اور یہیں سے میت کو عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ ہم میت کے جسم سے اس کی رُوح کے اس استثنائی، کمزور اور غیر مستقل تعلق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جبکہ ہم اس دنیا میں خواب کی صورت میں اس سے ملتی جلتی باتیں مشاہدہ بھی کر لیتے ہیں اور یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قبر سے مراد یہ زمینی گڑھا ہے ہی نہیں؟ اسی طرح اس زمینی گڑھے میں ہونے والے سوال و جواب اور عذاب و ثواب سے قطعی انکار ہمارے لیے ناممکن ہے۔

فَرَّغَ رِغَاءِ لِهَمِّهِ كِي عِثْمَانِي تَشْرِيحَ :

”فَرَّغَ رِغَاءِ لِهَمِّهِ“ کی شرح میں آپ کو بخاری کے کسی شارح الزین بن المنیر کی شرح بہت پسند آئی ہے اور اس شرح کا اشتقاق صاحب نے بھی اپنے خط میں ذکر

لے گو ہم سب موتی کے مسئلہ میں ان سب حضرات سے کئی طور پر متفق نہیں۔ تاہم ہم ان کے لیے ایسے غلط قسم کے القابات کسی صورت پسند نہیں کرتے۔

فرمایا ہے۔ اور وہ شرح یہ ہے کہ ”نَعَا لَهُمْ“ میں ”هُمْ“ کی ضمیر بعد میں آنے والے الفاظ ”أَنَا مَلَكَانِ“ کی طرف پھرتی ہے۔ اب اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی وارد ہوتے تھے۔ جن کے جواب بھی عثمانی صاحب نے دیے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اعتراضات اور ان کے جوابات چونکہ علمی انداز کے ہیں، اس لیے ہم ان کا جلد نذر لینا چاہتے ہیں۔

اعتراض ۱۔ اَهُمُّ جمع کی ضمیر ہے۔ اگر اس سے مراد فرشتے ہوتے تو تنبیہ کی ضمیر ”هُمَا“ ناچاہیے تھی۔

اس کا جواب عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ ”عربی زبان میں دونوں طریقے رائج ہیں۔ تنبیہ کے لیے جمع کا استعمال عام ہے جیسے قرآن کی آیت ہے:

”قَالَ كَلَّا فَإِذَا هَبَا پَايِلْتَنَا أَنَا مَعَكُمْ مُسْتَمْعُونَ“ (شعشعہ)

”فرمایا، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر۔ ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔“

”فَإِذَا هَبَا“ میں تنبیہ کی ضمیر ہے اور ”مَعَكُمْ“ میں جمع کی۔

اسی طرح بخاری کی حدیث غضر میں یہ الفاظ ہیں:

”فَمَرَّتْ بِرِمَا سَفِيلَتُهُ فَنَكَلُوا هُمْ أَنْ يَحْمِلُوهُمَا“

”پس گزری ان دونوں (موسیٰ و خضر) کے پاس سے ایک کشتی، پس انہوں نے (جمع کا صیغہ) کشتی والوں سے بات کی کہ وہ ان دونوں کو کشتی

میں سوار کر لیں“ (بخاری عربی جلد ۲۳، سطر ۱۱۵، ۱۶)

”فَنَكَلُوا هُمْ“ کے ساتھ ساتھ ”فَنَكَلْنَا هُمْ“ بھی بخاری کی روایت میں ہے

مگر حاشیہ پر اور نسخہ کے طور پر متن میں ”فَنَكَلُوا هُمْ“ کو ہی ترجیح دی گئی ہے جو تنبیہ کے بجائے جمع کا صیغہ ہے۔“

**جواب ۱**

عربی زبان میں تنبیہ کے لیے جمع کا صیغہ عام نہیں۔ اگر عام ہوتا تو گرامر کی کتابوں میں اس کا ضرور ذکر پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تنبیہ کی صورت میں جمع کا استعمال شاذ ہے اور اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے مثلاً:

پہلی مثال میں ”كُنْ“ کی ضمیر ”مَنْ“ کی وجہ سے آئی ہے۔ گویا فرعون کی طرف

جانے والے تو صرف دو تھے مگر سننے والوں میں اللہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور ضمیر جمع میں بدل گئی۔ دوسری مثال میں ایک مقام پر **كَلَّمُوْهُمَّ** اس لیے آیا ہے کہ موسیٰ نے ساتھ ان کا ایک ساتھی (یوشع بن نون) بھی تھا۔ جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ لیکن قابل ذکر چونکہ وہی ہستیاں تھیں یعنی موسیٰ و خضرؑ اس لیے اکثر تنزیہ کا ضمیر آیا اور ایک جگہ اشتباہ کی وجہ سے جمع کا ضمیر بھی آیا۔ اگرچہ اس کی حاشیہ میں تصحیح کر دی گئی۔

**اعترض ۲:** **هَمْ** کی ضمیر **اَلْمَلٰٓئِکَہٗ** سے متعلق ہے تو یہ پہلے کیسے آگئی؟ اس کا جواب عثمانی صاحب یوں دیتے ہیں کہ:

”عربی ادب کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر بات بالکل صاف ہو اور سننے والے سے غلطی کرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پہلے اسم کا ذکر نہیں کیا جاتا جیسے قرآن

میں ہے:

”اِنَّا اَنْشَاْنٰهُمْ اِنْشَاءً فَبَجَعَلْنٰهُمْ اَنْبَکَارًا“ (۳۶، ۳۵)

”ہم نے ان کو (ان کی بیویوں کو) ایک خاص اٹھان سے اٹھایا ہے اور ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں۔“

یاسورہ یسین میں:

”وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ“ (۹۶، ۹۷)

”اور ہم نے اس (پیغمبرؐ) کو شعر کی تعلیم نہیں دی“

جواب پہلی مثال اس لحاظ سے غلط ہے کہ ”اِنَّا اَنْشَاْنٰهُمْ“ سے چند آیات پہلے **خُوْرَعِيْنَ** کا مثال **اَللّٰوِیْہِ الْمَكْنُوْنِ** کا ذکر آچکا ہے۔ بعد میں جنت کی چند صفات بیان کر کے ”اَنْشَاْنٰهُمْ“ کی ضمیر **خُوْرَعِیْنَ** کی طرف پھیری گئی ہے جو درست ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اسے خواہ مخواہ ”اَنْبَکَارًا“ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہ لفظ بعد میں آیا ہے۔

جواب ایک مثال تو ایسی درکار تھی کہ ضمیر پہلے آئے اور اس کا مرجع اسم بعد میں ہو۔ پہلی مثال میں آپ نے بعد میں مرجع ”اَنْبَکَارًا“ جو بتلایا ہے، وہ ویسے ہی غلط ہے اور دوسری مثال میں ضمیر کا مرجع اسم مذکور ہی نہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب کا جواب

درست کیے سمجھا جائے؟

اب دیکھیے کہ کُتِبَ بِعَالِہِمْہُ کا مرجح "اضْحَابُہُ" واضح طور پر جب موجود ہے تو "ہُمْہُ" کا مرجح آخر "مَلَکَکَیْنِ" کیوں قرار دیا جائے؟ لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کو الزین بن الیزر کی تشریح اس لیے پسند آگئی کہ یہ آپ کے نظریہ کی تائید کرتی تھی۔

سماع موتی کے متعلق قول فیصل:

قرآن کی رو سے یہ ثابت ہے کہ مردے سن نہیں سکتے اور ہم خود بھی اسی بات کے قائل ہیں! — پھر قرآن ہی کی رو سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس قانونِ الٰہی میں بھی استثناء موجود ہے اور وہ استثناء یہ ہے کہ "إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ" یعنی "اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سنا سکتا ہے" اب اگر سماع موتی کا کيسر انکار کر دیا جائے تو "سماع موتی" کا از خود انکار ہو گیا۔ گویا یہ مسئلہ صرف "سماع موتی" کا نہیں بلکہ سماع موتی کا بھی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو سنا تو سنا سکتا ہے مگر سنا یا کبھی نہیں تو ثبات بھی کيسر غلط ہے۔ قلیب بدر کے مقولین کو اللہ تعالیٰ نے سنا دیا تھا۔ مٹی، اللہ کے اذن سے مردوں کو "حُفَّہُ" کہتے تھے تو وہ مردے یہ حکم سن کر ہی جی اٹھتے اور اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گویا ایسے واقعات کا اندازہ معجزانہ ہی کبھی لیکن ان کا انکار تو نہیں کیا جاسکتا۔ پھر چونکہ "سماع موتی" اور "سماع موتی" دونوں لازم و ملزوم ہیں لہذا "سماع موتی" بھی استثنائی صورتوں میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ گویا عام قاعدہ یہی ہے کہ مردے سن نہیں سکتے۔

نظریہ برزخی قبر کو مان لینے کا فائدہ اور ضرورت،

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ،

"دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات" حیات فی القبر کے ہم معنی اور قبر پرستی کے شرک کی اصل اور بنیاد ہے" (عذابِ قبر ص ۲۶)

اب دیکھیے جہاں تک شرک کی اصل بنیاد کے استیصال کا تعلق ہے، ہم بدل و جان عثمانی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ وہ شرک کی اصل بنیاد اس دنیاوی قبر میں عذابِ قبر کا اثبات اور حیات فی القبر قرار دیتے ہیں جبکہ ہم شرک کی اصل بنیاد سماعِ موتی کا علی الاطلاق وقوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ

درج ذیل ہیں:

- ۱- قبر میں زندگی اضطراری امور سے تعلق رکھتی ہے۔ دائمی اور مستقل ہرگز نہیں ہوتی۔ میت یا اس کی روح کا اس میں کچھ اختیار یا عمل دخل نہیں ہوتا۔
- ۲- پھر یہ نامکمل سی زندگی بھی ایسی ہے جس کا صحیح فہم ہمارے عقل و حواس سے ماوراء ہے۔ کیونکہ وہ عالم اور ہے اور یہ عالم اور۔ لہذا ان کی یہ زندگی بے کار ہے۔ نہ ہم انہیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں۔ نہ وہ ہماری بات سن سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں کچھ سنا، یا بتلا سکتے ہیں یا جواب دے سکتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کا ہمیں کیا فائدہ یا نقصان ہے؟ ان کی اس زندگی میں اللہ تعالیٰ یا اس کے حکم سے فرشتے ہی انہیں کچھ سنا، یا وہ ان سے کچھ سن سکتے ہیں یا سوال و جواب کر سکتے ہیں۔ گویا اصل مسئلہ جو شرک کی بنیاد بنتا ہے وہ سماج موتی کا ہے نہ کہ دنیوی قبر میں عذاب و حیات فی القبر! ————— لہذا ہماری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی جملہ مساعی و اعمال موتی کی تردید میں صرف سمجھتے۔ ان شاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔



# سماع موتی سے تصرفاتِ اولیاء تک

## اسکالات (۳)

بلسلہ روح، عذابِ قبر اور سماعِ موتی  
(یہ جوابات محدث کی تین اقساط جلدی الآخرہ برجب اور شعبان ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوئے)

سماعِ موتی سے بیکراکار کرنے والوں کے بعد اب سماعِ موتی کے قائلین کی طرف سے اعتراضات کی باری آئی۔ اس سلسلہ میں جو بدی محمد علی صاحب حنفی (پکا ڈیرہ و ڈرائیجاں کوٹ) رغبتِ ضلع شیخوپورہ کی طرف سے ادارہ محدث کے نام ایک طویل ترین خط موصول ہوا۔ جو خط سے زیادہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی آخر میں یہ آرزو بھی کی گئی ہے کہ:

”آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ ”محدث“، جو کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے، تصویر کا دوسرا رخ بھی شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ تاکہ ”محدث“ کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں؟“

یہ خط یا مضمون فل سکیپ کے مکمل دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، تحریر گنجان ہے جو محدث کے ۴۸ ویش ۲۵ صفحات کا متقاضی ہے۔ پھر اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ صفحات جواب کے لیے بھی درکار تھے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ایک ماہوار رسالہ ایک قسط میں تو یہ سب کچھ شائع نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر ایک قسط میں صرف یہ خط یا مضمون شائع کیا جاتا اور اگلے پرچے میں جوابات دیے جاتے تو قارئین کو تقابل میں دقت محسوس ہوتی۔ اور اگر خط کا محض خلاصہ میں اپنی طرف سے

پیش کر کے اس کے جوابات قلمبند کر دیتا۔ تو مضمون نگار کی طرف سے اعتراضات کی گنجائش باقی رہتی۔ لہذا مضمون نگار کی آرزو کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس مکمل خط یا مضمون کو بائیں صورت شائع کیا جائے کہ پہلے اس کا ایک حصہ من و عن نقل کرنا جائے پھر اس کا جواب لکھ دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر یہ مکمل مضمون بمعہ جوابات دو یا تین اقساط میں بھی شائع ہو، تو قارئین وارد شدہ اعتراضات کے ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔ جواب لکھنے میں میں نے حتی الوسع اختصار سے کام لیا ہے اور صرف ان باتوں کا جواب دیا گیا ہے جن کا جواب دینا ضروری تھا اور جن پر سواشی کے نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ پھر اسی ترتیب سے ان کا جواب بھی لکھا گیا ہے۔ جبکہ اصل مضمون کا من و عن شائع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ صاحب مضمون کو یہ حسرت نہ رہ جائے کہ ان کا مضمون قطع و برید کے ساتھ یا تو ٹر مروڑ کر شائع کیا گیا ہے۔

(عبد الرحمن کیلانی)

## سماع موتی - تصویر کا دوسرا رخ

محرمی ایڈیٹر صاحب ماہنامہ ”محدث“ لاہور

سلام مسنون! چند ماہ سے آپ کے رسالہ ”محدث“ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں اور محدث میں چھپنے والے معیاری علمی مضامین سے کافی متاثر ہوں۔ اس وقت میرے سامنے آپ کے ماہنامہ ”محدث“ بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء، ماہ جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارے ہیں۔ جن میں جناب مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب کا مضمون ”روح، عذاب قبر، سماع موتی“ قسط وار شائع ہوا ہے۔ جس میں کیلانی صاحب نے قائلین سماع کے دلائل سے مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ اسی سلوک نے مجھے آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ بخشا ہے تاکہ کیلانی صاحب کو ان حقائق سے روشناس کرایا جائے، جنہیں مولانا موصوف نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔

۷۷۔ اس کتاب میں ترتیب بدل دی گئی ہے اور پیش لفظ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے



مولانا کیلانی صاحب نے قرآن مجید کی چند آیات اور چند احادیث کے حوالے سے جو رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:  
سماع موطی ایک تحقیقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ شرک کا چور دروازہ ہے (گویا قائلین سماع مشرک ہیں)۔

غائب شدہ بزرگوں کو پکارنا ان کی عبادت کے مترادف ہے۔ غیب یا فوت شدہ بزرگ کسی کی پکار کر جواب دینا تو درکنار ان کی بات بھی نہیں سن سکتے۔ قبروں میں پڑے ہوئے لوگ زندہ نہیں بلکہ بے جان اور مردہ ہیں اور انہیں اپنی ذات سے متعلق بھی کچھ علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟

اس مسئلہ میں قرن اول میں اختلاف موجود تھا۔ حضرت قتادہ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موطی کے منکر تھے۔ قلیب بدر والی حدیث حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ جن احادیث سے سماع موطی ثابت ہوتا ہے۔

### ۱۰ کیا سماع موطی کے قائل مشرک ہیں؟

میں نے سماع موطی کے قائلین کو کسی جگہ بھی مشرک نہیں کہا۔ یہ مولانا محمد علی صاحب کا اپنا خیال ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مفسر شاہ فاروق ہاشمی صاحب نے پوچھا تھا کہ سماع موطی کے قائلین کے حق میں آپ کیا فتوے دیتے ہیں؟ تو میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ ”میں کوئی فتویٰ دینے کے حق میں نہیں ہوں، البتہ آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ اس سلسلہ میں تشدد نہ ہوں“ (محدث رمضان ۱۴۰۲ھ ص ۲۱۱)

— رہی یہ بات کہ یہ شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ کیسے ہے؟ تو اگر تو بات صرف سماع موطی تک محدود رہتی تو اس میں حرج بھی نہ تھا۔ مگر جب بات یوں بڑھے کہ مردے علی الاطلاق سلتے ہیں اور ہر آنے والے کی ہر وقت سنتے ہیں۔ پھر صرف سنتے ہی نہیں، جواب بھی دیتے ہیں۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی کرتے ہیں۔ پھر صرف قبر پر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ سے سن سکتے ہیں۔ تو بتلائیے کہ اور شرک کسے کہتے ہیں؟ ندا بغیر اللہ اور کیا چیز ہے؟ جس کی قرآن پُر زور تردید کرتا ہے جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ اللہ کے سوا جتنے بھی معبود ہیں سب باطل ہیں۔  
۱۱ یہ بحث ذرا تفصیل سے آگے چل کر آئے گی۔

دھتیرے اور چوتھے درجہ کی ہیں، جو قابل احتجاج نہیں ہوتیں۔ جو توں کی چاپ سننے والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میت کو احساس دلایا جاتا ہے کہ جن عزیز و اقارب کی وجہ سے ٹو مارا مارا پھرتا تھا وہ کچھ تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں، اس کے علاوہ اسے کچھ سنانی نہیں دیتا۔

یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ میری صفحہ کو لوٹاتا ہے، سچی کہ میں اس سلام کا جواب دیتا ہوں جو مسلمان مجھ پر سلام بھیجتا ہے“ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ نہیں جیسا کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اگر زندہ ہوں تو روح کے لوٹائے جانے کا کچھ مطلب نہیں نکلتا۔

قرآن مجید سمارح کی پرزور تردید کرتا ہے ضعیف، وضعی احادیث سمارح موٹی کا جواز مہیا کرتی ہیں۔ اماموں اور بزرگوں کی روایات سب خرافات ہیں۔ انہیں ماننا گویا قرآن و سنت سے دستبردار ہونا ہے۔

مولانا کیلانی صاحب نے اکابر مغترین پر اعتماد کرنے کی بجائے من مانے نتائج اخذ کیے ہیں اور اگر اعتماد کیا ہے تو مولانا مودودی صاحب پر گویا کیلانی صاحب نے جو تشریحات کی ہیں اور مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے قرآن و سنت کا منشا بھی یہی ہے۔

مولانا مودودی نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے دین کو ماضی حال کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن و سنت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے اور کرتے ہیں (رواد و اجتماع) کیلانی صاحب نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ ”اللہ کا شکر ہے کہ اہل حدیث نہ کسی امام کا مقلد ہے نہ علامہ کا، وہ ان بزرگوں سے استفادہ تو کر سکتا ہے مگر روشنی براہ راست قرآن و سنت سے حاصل کرتا ہے“۔

الزام یہ نہیں کہ مولانا مودودی صاحب قرآن و سنت کو دین کا ماخذ کیوں سمجھتے تھے اور کیلانی صاحب کیوں سمجھتے ہیں؛ بلکہ اعتراف یہ ہے کہ ماضی کے اشخاص اور

بزرگوں میں صحابہ کرام سے تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین و محدثین سب آجاتے ہیں۔ بقول علامہ ارشد القادری، (مصلحت زلزله) (یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی مشترک اور متوارث کوششوں سے دین اپنی واضح اور مفصل تشریحات کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ لیکن نہ مولانا مودودی صاحب کو ان بزرگوں کی فکر و دیانت پر اعتماد تھا اور نہ کیلانی صاحب کو ہے، یہ سب کی راستے ٹھکرا کر اپنی برتری منانا چاہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت ہی دین کا اصل ماخذ ہے، لیکن بحث الفاظ و عبارات میں نہیں، ان کے مفہوم و معانی میں ہے۔ گئے اور ظاہر ہے کہ مفہوم کے تعین میں فہم

### ۳۔ بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششیں؟

اب دیکھیے ان بزرگوں کی مشترک اور متوارث کوششوں سے ہی دین شیعہ حضرات کو بھی پہنچا ہے۔ بریلویوں، قادیانیوں، اہلحدیثوں کو بھی۔ غرضیکہ سب حضرات دین کی تفہیم کے بارے میں اپنے اپنے ڈانڈے سے انہی بزرگوں کے واسطے سے تابعین اور صحابہ تک پہنچاتے ہیں تو کیا یہ سارے کے سارے فرقے حق پر ہیں؟ آخر کون سی دلیل سے آپ اپنے علاوہ دوسروں کے بزرگوں کے فہم کو رد کر سکتے ہیں؟

۱۔ میں اپنا فہم پہلے بھی بوضاحت پیش کر چکا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ،

۱۔ قرآن سماع موتی کی پرزور تردید کرتا ہے۔

۲۔ پھر قرآن ہی سے اللہ تعالیٰ کے، مردوں کو سننے کی استثنائی صورت بھی ثابت ہوتی ہے جس کی تائید بعض احادیث صحیحہ بھی کرتی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث یا تیسرے اور چوتھے درجہ کی احادیث سماع موتی کا

علی الاطلاق جواز ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ بعض بزرگوں کے اقوال صرف سماع موتی تو درکنار، ان مردوں کے جواب دینے اور حاجت روائی اور مشکل کشائی یا تصرف فی الامور کی بھی پرزور تائید کرتے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے مترجخ خلاف ہیں۔

پھر مجھے قطعاً یہ اصرار نہیں کہ دوسرے لوگ میرے فہم کو قابل اعتماد سمجھیں بلکہ ان کے لیے بھی یہی راہ صواب ہے کہ وہ ہر بات کو کتاب و سنت پر پیش کرنے کے بعد کسی بات کو درست یا نادرست قرار دیں۔

ہی کو دخل ہے۔ اور جب اکابر امت کا فہم مولانا مودودی صاحب کے نزدیک قابل اعتبار نہیں تھا اور جناب کیلانی صاحب کے نزدیک نہیں ہے تو خود ان کے فہم پر کوئی کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟

قیامت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی آئی ہے،  
 ”اس امت کے پھلے اگلوں پر لعن طعن کریں گے“ (ترمذی جلد دوم)

### ۵۔ پچھلوں کا پہلوں پر لعن طعن۔

لعن طعن کرنا اور بات ہے۔ ان کی عزت و تعظیم کرنا اور بات، اور ان کے اقوال و ارشادات کو قابل اتباع اور حجت سمجھنا اور بات ہے۔ لعن طعن کرنے والے تو شیعہ حضرات ہیں جو علی الاعلان صحابہ کرام پر تبر بولتے ہیں۔ یا پھر خارجی، نامبی، رافضی وغیرہ ہیں۔ جو علی الاعلان لعن طعن نہ بھی کریں، تاہم ان کے منہ سے ان بزرگوں کے حق میں کلمہ خیر کم ہی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی بھی بزرگوں پر لعن طعن نہیں کرتا۔ صحابہ کرام اور تابعین تو درکنار، ہم تو انہی کرام کو قابل تعظیم اور ان کی کوششوں کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک کی ہر اک بات کو ہم من و عن تسلیم کر لیں جبکہ ہمارے پاس ایک معیار موجود ہے کہ دین کی ہر ایک بات کو کتاب و سنت پر پیش کیا جانا چاہیے۔ اب اگر کسی بزرگ کی بات اس معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے ناقابل قبول سمجھی جائے تو اس سے لعن طعن کا کونسا پہلو نکلتا ہے؟ اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھاؤں گا۔

امام نسائی نے اپنی سنن (کتاب الحج) میں مروان بن حکم سے روایت کی، کہ میں حضرت عثمانؓ کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے حضرت علیؓ کو عمرہ اور حج دونوں (یعنی حج قرآن) کی لیک کہتے ہوئے سنا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو اس سے منع فرمایا اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ،

”فَكَفَّ أَدْعَاؤُكَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ“

(نسائی، کتاب الحج، باب القرآن)

”میں تمہارے قول کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ”بڑی جماعت کی پیروی کرو“ یعنی جس طرف

قول کو نہیں چھوڑ سکتا۔

غور فرمائیے۔ حضرت عثمانؓ اپنے دور خلافت میں حضرت علیؓ کو مکمل اس بات سے منع کرتے ہیں۔ (جس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کو پہلے اس کا علم نہ تھا) لیکن حضرت علیؓ نے آپؐ کے قول کی کوئی پروا دینیکی تو پھر دوسرے ائمہ کرام یا بزرگانِ دین کس شمار و قطار میں ہیں؟

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والدِ محترم سے حج تمتع کے بارے میں اختلاف کیا۔ اور حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ ”میں تو آپؐ کو رسول اللہ کا قول سنا تاہم اور آپؐ اپنی بات کرتے ہیں“ غرضیکہ ایسی مثالیں دورِ مصابہ میں کافی مل جاتی ہیں۔ اب ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت علیؓ کا حضرت عثمانؓ کو اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا حضرت عمرؓ کو یہ جواب لعن طعن کیسے کہلا سکتا ہے؟

ائمہ مشائخ کے اقوال کو حجت سمجھنا انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔

اب ان ائمہ کرام اور بزرگانِ دین کی مشترک اور متوارث کوششوں کا دوسرا پہلو بھی سامنے لائیے۔ ان حضرات کی ہر بات کو قابلِ اتباع سمجھنے کا دوسرا نام تقلیدِ اہلِ باب یا آباء پرستی ہے۔ جسے قرآنِ کریم نے بہت سے مقامات پر مردود و قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے یہی ائمہ کرام اور بزرگانِ دین تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِن تَخَذُوا آخِبَارَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ أَن يَأْتِيَا قَوْمًا دُونِ اللَّهِ“

”انہوں نے علماء اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب بنالیا تھا“

اس آیت سے متعلق جب عدنی بن حاتم۔ جو پہلے عیسائی تھے۔ نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! ہم اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں سمجھتے تھے“ تو رسول اللہؐ نے جواب دیا۔ ”کیا تم ان کے بتلائے ہوئے حلال کو حلال، اور حرام کو حرام نہیں سمجھتے تھے؟“ عدنی بن حاتم نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات تو تھی“ تو آپؐ نے فرمایا، ”رب بنانے کا یہی مطلب ہے“ (ترمذی، الباب التفسیر، سورۃ توبہ)

اکثر علماء ہوں!۔ جبکہ کیلا فی صاحبہ پھلوں کی تحریروں کو مردود ٹھہرا کر صبح

گویا یہود و نصاریٰ کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ بزرگان دین اور ائمہ کرام شریعت کو ہم سے بہتر سمجھتے اور ہم سے بہت زیادہ نیک اور متقی تھے لہذا وہ دین کی باتوں کو شریعت کے اصل مآخذ پر پیش کرنے کی بجائے انہی بزرگوں اور ائمہ کرام کے اقوال و ارشادات کو قابل اتباع سمجھ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ دین ہمیں انہی بزرگان دین کی مشترک اور متوارث کوششوں سے پہنچا ہے۔

فرقہ پرستی کی اصل بنیاد۔

اور تیسری قابل غور بات یہ ہے کہ دین میں جب کبھی بھی بگاڑ پیدا ہوا ہے تو انہی ائمہ کرام اور مشائخ عظام کے اقوال و ارشادات کو حجت اور واجب اتباع سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یہی بات فرقہ پرستی کی بنیاد بنتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

وَهَلْ أَكْسَدَ الَّذِينَ إِلَّا الْمَلُوكُ وَأَخْبَارُ سُوءِ رُؤُفَبَانِهَا

یعنی "دین کو تباہ و برباد کرنے والے تین ہی گروہ ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ،

علماء سوء اور بزرگان دین۔"

اسی لیے امام مالکؒ رسول اللہؐ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے:

"صرف یہی وہ ہستی ہے جس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ باقی رہے دوسرے لوگ، تو ان کی باتوں کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی۔"

اور امام بخاریؒ نے تو "کتاب الاعتصام بالسنة" میں ایک مستقل باب

باندھا ہے جس کا عنوان ہے:

"آنحضرتؐ کے سلسلے میں ایک بات کی جائے اور آپؐ اس پر انکار

نہ کریں تو یہ حجت ہے۔ آپؐ کے سوا کسی اور کی تقریر محبت نہیں۔"

لے بڑی جماعت یا سواد اعظم کا مفہوم؟

"بڑی جماعت یا سواد اعظم سے موصوف نے "اکثر علماء" مراد لی ہے۔ اگر ان کا

یہ مفہوم درست سمجھا جائے تو یہ بات بھی کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تشریحات کو اپنی اور اپنے چند ہم خیالوں کی تحریروں میں مقتدے سمجھے ہوئے ہیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذِهِ الْأَحْبَارَ وَالرُّهْبَانِ  
لِيَا كُفُّوا أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ  
اللَّهِ“ (التوبة: ۳۴)

”اے ایمان والو! علماء اور مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو ناحق لوگوں  
کے مال کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں“  
گو یا علماء و مشائخ کی اکثریت خدائی احکام کی غلط تعبیر پیش کر کے ایک تو لوگوں  
سے پیسے بٹورتی ہے اور دوسرے شریعت کی راہ میں روک بن جاتی ہے۔ اور یہاں  
یعنی مشائخ عظام یا بزرگان دین کے متعلق بھی بالوضاحت فرمایا کہ،  
”وَكُفِّرُوا بَيْنَكُمْ وَمَعَهُ فَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ“ (المائدہ: ۲۷)

”ان میں سے اکثر ناحق ہوتے ہیں“  
ان آیات کی روشنی میں محض علماء کی اکثریت کو کیسے واجب الاتباع قرار دیا جا  
سکتا ہے۔؟

بڑی جماعت کے حقیقتاً وہ جماعت مراد ہے جو نظام خلافت قائم کرتی یا رکھتی ہے۔ آپ کے  
ایسے ارشادات کا تعلق سیاسی امور سے ہے۔ جیسا کہ آئیے فرمایا:۔

لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِإِجْمَاعٍ، وَلَا  
جَمَاعَةٍ إِلَّا بِالْإِمَامِ، وَلَا أَمِيرٍ  
إِلَّا بِاتِّمَاعٍ وَالطَّاعَةِ۔  
اسلام جماعت کا متقاضی ہے اور جماعت  
امیر کی اور امیر کی امارت تب ہی مستحکم ہو سکتی ہے  
کہ اس کی بات سنتی اور اس کی اطاعت کی جائے۔

اس بات کی مزید وضاحت درج ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے:۔

”حضرت عرفج کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر تمہارے معاملات  
کسی ایک شخص پر مجتمع ہوں پھر کوئی دوسرا شخص تمہاری قوت کو توڑے یا تفرقہ ڈالے تو اسے  
قتل کر دو۔“ (مسلم - کتاب الامارہ والقضاء)۔

”حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت نہ نکلا اور  
جماعت کے الگ ہوا پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔“ (مسلم - حوالہ ایضاً)۔

آخر ایسا مسئلہ جس پر اکابر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہوگی مخالفت کرنا  
کوئی دینی خدمت ہے؛ جبکہ سماع موتی کے باب میں اکابر علماء نے بھی قرآن و سنت  
ہی سے استدلال کیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”باجملہ کتاب و سنت مملوہ مشحون اند کہ دلالت می کند بر وجود

علم موتی را بدینا و اہل دنیا پس منکر نشود آں را جاہل باخبار و منکر دین“

(اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۱۸)

ترجمہ: ”مختصر یہ کہ کتاب و سنت ایسے دلائل سے بھر پور ہیں جو اموات میں دنیا و  
اہل دنیا کے علم و معرفت اور احساس و شعور پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا سماع اموات کا  
منکر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اخبار و روایات سے بے خبر ہو یا پھر ضروریات  
دین کا منکر“

### کے سماع موتی پر اجماع اہمیت؟

سماع موتی کے مسئلہ پر اجماع تو صحابہ میں بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا تو پھر آپ  
کون سے اکابر علماء امت کے اجماع کی بات کرتے ہیں؛ علاوہ ازیں ہم پہلے مرعاۃ  
شرح مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۵ کے حوالہ سے بتلا چکے ہیں کہ صرف ایک عبد اللہ بن عمر  
سماع موتی کو درست سمجھ کر رسول اللہ کی قبر مبارک پر آکر سلام کرتے تھے۔ دوسرے  
کسی صحابی سے یہ عمل ثابت نہیں۔

### شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور پیران پیر کی نماز۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی وہ محدث ہیں جنہوں نے سماع موتی کو بنیاد بنا کر  
”صلوٰۃ غوثیہ“ پاپیری پیر کی نماز تک کو جائز اور درست تسلیم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:  
”آپ (سید عبد القادر جیلانی) نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر  
رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکار پر  
درو بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے حاجت بڑی  
کرے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر  
دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے)۔“ (اخبار الاخیار مصلفہ عبدالحق محدث



حضرت سراج الهند مولانا شاہ عبد الغریز ابن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

”بالجملہ انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نباشد در الحاد بولدن اوشبہ نیست“  
 تنجکھا ”مختصر یہ کہ اگر اموات کے احساس و شعور کا انکار کفر نہ ہو مگر منکر کے الحاد و بے دینی میں شبہ نہیں ہے“

دہلوی مترجم اردو سچان محمود ص ۱۴۹، ۱۵۰، نیز دیکھیے، سیرۃ نوح الثقلین مصنفہ ضیاء اللہ قادری ص ۲۴۲

غور فرمائیے، محدث صاحب کے اس پورے بیان میں صرف آخری ایک عبارت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلاشبک و شبہ تحقیق شدہ ہے۔ اور یہ بات ہے بھی قرین قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو، وہاں صرف گیارہ قدم جانب عراق (ابن ہادی جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی بات (منہ) تلاش کرنے سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

”إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُكَ وَلَئِنَّا كُنَّا نَسْتَعِينُكَ“ (الفاتحہ: ۴)

(اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

اور دوسری طرف عبد الحق محدث صاحب کا یہ تحقیق شدہ بیان ہے۔ ان میں مناسبت و موافقت آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔ محدث صاحب نے جن بلند پایہ مراجع سے تحقیق فرمائی ہے، وہ یہ ہیں،

بہرۃ الاسرار، قلادۃ الخواہر، زبدۃ الآثار، نزہۃ الخاطر، اللغات، اور تفریح الخاطر۔

دیکھئے ان میں کوئی بھی حدیث کی کتاب ہے؟ — یہ ہے، اکثر علماء کے اقوال کو واجب الاتباع سمجھنے کا نتیجہ!

۱۵ اموات کا احساس و شعور۔

اموات کے احساس و شعور سے کسے انکار ہے؟ اگر ان میں احساس و شعور نہ ہو تو قبر کا عذاب کیسے ہو سکتا ہے اور اموات جنت کے فوائد سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس احساس و شعور سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اہل دنیا کی باتیں بھی سن سکتے ہیں؟

مولانا عبدالرحمن کیلانی صاحب کے قرآن مجید سے انکارِ سماع سے

### متعلق دلائل اور ان کا تجزیہ

دلیل نمبر ۱: والذین یدعون . . . . . ترجمہ - "اور جنہیں خدا کے سوا یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ تو خود پیدا شدہ ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان۔"

کیلانی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اموات غیر احیاء کا اطلاق نہ جنتوں پر ہو سکتا ہے نہ فرشتوں پر . . . . . باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

کیلانی صاحب کا اخذ کردہ یہ نتیجہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔ فوت شدہ بزرگوں میں انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، صالحین بھی داخل ہیں۔ انبیاء کرام کی حیات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مَنْ رَسَلْنَا أَنْ جَعَلْنَاهُمْ دُونَ الرَّحْمَنِ يُعْبَدُونَ۔

ترجمہ - وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے پوچھ

مَنْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ يُعْبَدُونَ؟ (ادارہ)

اسی عالم دنیا میں ایک سو یا ہوا شخص پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں کی گفتگو نہیں سن سکتا، تو دوسرے عالم یعنی عالم برزخ میں پہنچا ہوا شخص اس عالم دنیا کی باتیں کیونکر سن سکتا ہے؟ بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سو یا ہوا شخص احساس و شعور رکھتا ہے۔ اور اسی احساس و شعور کی وجہ سے خواب میں چلتا پھرتا، باتیں کرتا اور سنتا ہے۔

### ۱۔ قرآنی دلیل کا جواب

یہاں لفظ "وَأَسْأَلُ" کا ترجمہ بعض مترجمین نے پوچھو کے بجائے "احوال دریافت کرو" بھی کیا ہے (مثلاً فتح المجید ترجمہ فتح محمد خالد حمیری) تاہم حاشیہ میں اکثر مفسرین نے وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد ان رسولوں کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہے مثلاً،

یعنی کہ ہم نے ذاتِ رحمنِ جلِ وعلیٰ کے بغیر کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے یقیناً ایسا نہیں۔

۱- ترجمہ شاہ رفیع الدین حاشیہ موضع القرآن (شاہ عبدالقادر) ص ۱۰۲ یعنی ان رسولوں پر جو کتابیں اتری تھیں ان کو دیکھ لے یا ان کی امت کے لوگوں سے پوچھ لے ؟  
 ۲- موضع القرآن از وحید الزمان نے بھی حاشیہ پر بالکل یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔  
 ۳- تفہیم القرآن: شاہ رسولوں سے پوچھنے کا مطلب ان کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے۔ جس طرح ”فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ الْوَسْطَى“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، ان سب کے پاس جا کر دریافت کرو۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات انہیں سکھادی کہ اللہ جل شانہ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے ؟

۴- ترجمہ رضا خاں بریلوی (کنز الایمان) اور حاشیہ نعیم الدین مراد آبادی ص ۱۰۲ سے سوال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے آویان وطل کی تلاش کرو۔ کہیں بھی کسی نبی کی امت میں بُت پرستی روارکھی گئی ہے؟ اور اکثر مفسرین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ مومنین اہل کتاب سے دریافت کرو۔ کیا کسی نبی نے غیر اللہ کی عبادت کی اجازت دی؟ تاکہ مشرکین پر ثبات ہو جائے کہ مخلوق پرستی نہ کسی رسول نے بتائی نہ کسی کتاب میں آئی۔ یہ بھی ایک روایت ہے کہ شبِ معراج سید عالم نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ جب حضور نماز سے فارغ ہوئے جبریل نے عرض کیا کہ اے سرورِ اکرمؐ، اپنے سے پہلے انبیاءؑ سے دریافت فرما لیجئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی اور کی عبادت کی اجازت دی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سوال کی کچھ حاجت نہیں۔ یعنی اس میں کوئی شک ہی

اگر انبیاء کرام میں حیا نہ ہوتی، وہ خطاب و مذاکرہ نہ سمجھتے ہوتے اور جواب

نہیں کہ تمام انبیاء توحید کی دعوت دیتے آئے۔ سب نے مخلوق پرستی کی ممانعت فرمائی۔“

اب دیکھیے ہم نے چار مختلف مکاتب فکر کے مفسرین کے حواشی پیش کر دیے ہیں۔ اور چاروں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ یہاں ”وَاشْتَقَلَّ“ سے مراد ان کی کتابوں سے یا مؤمنین اہل کتاب سے معلوم کرنا ہے۔ نہ کہ گزشتہ رسولوں سے دریافت فرمانا۔ اور پانچویں فتح محمد جان دھری بھی ہیں۔ جنہوں نے ترجمہ میں ہی مسئلہ حل کر دیا۔ البتہ کنز الایمان کے مفسر نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے ایک روایت بھی درج فرمائی۔ اور یہی روایت جناب محمد علی صاحب مضمون کو بھی پسند آئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مضمون میں یہ روایت تفسیر کھیرچ، ص ۴۳۰ کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔ لیکن یہ روایت غلط معلوم ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ سورۃ زخرف کی یہ آیت واقعہ معراج سے کافی عرصہ بعد نازل ہوئی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل، جس میں مسجد اقصیٰ کے واقعہ کا ذکر ہے، کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۵۰ ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف کا ترتیب نزول کے حساب سے نمبر ۶۳ ہے۔ معراج کا واقعہ ہجرت سے دو سال قبل کا ہے۔ جبکہ سورۃ زخرف اس وقت نازل ہوئی جبکہ کفار آپ کی جان کے درپے تھے۔ جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۹، ۱۰، ۸۰ سے واضح ہے۔ لہذا قبل از نزول آیت مذکورہ، جبریل کا حضورؐ سے یہ کہنا کہ ”ان رسولوں سے پوچھ لیجئے اور پوری آیت پڑھ جانا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

وضعی روایت اور سماع موتی۔

پھر اگر اس روایت کو درست بھی تصور کر لیا جائے تو بھی اس پر درج ذیل اشکال وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ مسجد اقصیٰ میں سوالا کھ پیغمبروں کے (ہندوئی زندگی میں جمع ہونے کے علاوہ) اس سے قبل، تمام بنی نوع انسان کی ارواح کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت بھی

کی قدرت ان میں نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل سے دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔

کنز العمال میں حدیث ہے۔ من صلی علی عند قبری سمعته  
ومن صلی علی من بعید علمته (ابو شیخ عن ابی ہریرۃ)  
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ  
وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری قبر کے پاس درود پڑھا میں خود سنا ہوں اور جس شخص  
نے مجھ پر دور سے درود پڑھا میں اس کو جانتا ہوں۔

حدیث ۲: عن ابی ہریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عافر کیا تھا جب ان سے عہد "الست" لیا تھا۔ اور اس دور کو خدا تعالیٰ  
نے موت کا دور کہا ہے تو پھر تو سماع موتی کے قائلین کو اس معراج والے  
سوال جواب کے بجائے اس واقعہ سے ثبوت پیش کرنے کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ  
اس موت کے دور میں روحوں نے صرف سنا ہی نہیں تھا بلکہ جواب بھی دیا تھا۔  
۲۔ جبریلؑ نے حضور اکرمؐ سے کہا بھی کہ انبیاء حاضر ہیں۔ ان سے سوال  
لیجئے۔ لیکن آپؐ نے پھر بھی سوال نہیں کیا تو اس آیت پر عمل کیا ہوا؟

۳۔ پھر جب آپؐ نے سوال ہی نہیں کیا، نہ ہی انبیاءؑ کی ارواح نے کچھ جواب  
دیا تو سماع موتی ثابت کیسے ہوا؟ اور اس روایت سے آپؐ کا استدلال درست کیونکر؟  
ان تصریحات سے البتہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "وَأَسْئَلُ" کا حکم  
وجوب کے لیے نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ یعنی اگر آپؐ چاہیں تو سابقہ انبیاءؑ کی  
کتاب یا ان یہود و نصاریٰ کے مومنین یا بمصدیق روایت بالانبیاءؑ کی ارواح سے  
پوچھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپؐ کو یقین تھا کہ ایسی بات کا کسی الہامی کتاب میں  
لکھا ہونا ناممکن ہے۔ لہذا آپؐ نے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھا اور نہ ہی سماع موتی  
کے استنباط کی گنجائش باقی رہی۔

۴۔ دوسری وضعی روایت۔

اس موضوع حدیث پر پہلے ص ۵۳ پر بحث گزر چکی ہے۔

ما من احد یسلم علی الا علی روحی ارد علیہ رواہ الطبرانی فی الاصحیح  
 "رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھے مگر اللہ تعالیٰ  
 مجھ پر روح کو لوٹا لے تاکہ میں اس کا جواب دے دوں" اور کوئی وقت ایسا نہیں  
 جب آپ پر درود و سلام نہ پڑھا جائے۔ آپ ہر وقت صلوٰۃ و سلام کا جواب  
 روح بمعہ جسم ہی عطا فرماتے ہیں۔

اب کیلانی صاحب ہی بتائیں کہ ان بزرگ ہستیوں (انبیاء کرام کو ایک مسلمان  
 کیسے بے جان لاشیں تصور کرے۔ شہداء سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ولا تقولوا  
 لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء وکن لا تشعرون۔  
 جو لوگ اللہ تبارک تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیے گئے انہیں مردہ نہ کہو بلکہ  
 وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ اس آیت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے  
 بزرگوں کی لاشیں بے جان نہیں تھیں کیلانی صاحب حقیقت یہی ہے کہ سورۃ نحل کی

عہ چوہدری صاحب نے اپنے مضمون میں عربی عبارات کثرت لکھی ہیں۔ پھر اعراب کے بغیر  
 بھی ہیں جبکہ ارد عبارت میں اکثر پنچوشن کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ادارہ محدث اگرچہ اعراب  
 صحت لفظی وغیرہ کا خصوصی التزام کرتا ہے لیکن ہم نے چوہدری صاحب کی عبارات کو نہ  
 درست کیا ہے نہ ان پر اعراب وغیرہ لگائے ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ ان کا مضمون من و عن  
 شائع ہو ورنہ قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس حدیث کی عبارت کو انہوں نے مضحکہ خیز رنگ  
 بگاڑ دیا ہے۔ حالانکہ کیلانی صاحب کے جن مضمون پر وہ تعاقب کر رہے ہیں، اسی مضمون سے اس کی  
 صحت عبارت نقل کی جا سکتی تھی، جو یوں ہے: "ما من احد یسلم علی الا روحی اللہ علی  
 روحی حتی ارد علیہ السلام" (محدث جلد ۲، عدد ۲-۳ ص ۲۴)

یہ وضاحت اسلئے کر دی ہے کہ قارئین کرام مدیم صحت عبارت کو ادارہ کا تسلیم سمجھیں۔ (ادارہ)

۱۳ تیسری وضعی روایت۔

طبرانی کی اس حدیث پر بھی ص ۵۲ پر بحث گزر چکی ہے۔

۱۳ شہداء کی زندگی ہمارے جیسی نہیں۔ اگر ہمارے جیسی موتی تو ہم  
 اسے ضرور سمجھ سکتے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ قبروں میں پڑے ہوئے بزرگ زندہ ہیں  
 ہماری بات سنتے، جواب دیتے اور ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں تو ایسی زندگی کو ہم  
 سمجھ سکتے ہیں اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف ہے، نیز دیکھئے ص ۱۳۱ اور کتاب ہذا۔

یہ آیت مبارکہ کفار کے معبودانِ باطل بتوں وغیرہ کے حق میں نازل شدہ ہے۔  
 دلیل - ۲۔ ترجمہ - زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا  
 سکتا ہے لیکن (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں  
 میں مدفون ہیں۔ فاطر - ۲۲

اس آیت سے استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس آیت کا حاصل  
 یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اللہ سنا  
 سکتا ہے۔

دلیل نمبر - ۳۔ ترجمہ - اور اس شخص سے رُحِ مکرمہ کون گمراہ ہو گا جو ایسے  
 کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے بلکہ ان کو ان لوگوں کے  
 پکارنے کی خبر بھی نہ ہو۔ پھر جب لوگ مدوز قیامت اکٹھے کیے جائیں گے۔  
 تو وہی پکارے گئے لوگ ان پکارنے والوں کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی  
 پرستش سے انکار کر دیں گے (الاحقاف ۶۵)

کیلائی صاحب کی تشریح - آیت نمبر میں وَهْوَ عَنْ دُعَاءِ يَوْمِهِمْ  
 غُفْلُونَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے  
 ہیں کیونکہ وہ دعائیں سن سکتے ہیں اور گائے گائے اَعْدَاءُ کے الفاظ بتوں  
 اور مظاہر قدرت کو معبودانِ باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں ... اب  
 صرف فوت شدہ بزرگ ہی رہ جاتے ہیں جو اس آیت کا صحیح مصداق بن  
 سکتے ہیں۔

مولانا کیلائی صاحب کا یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ بزرگوں کے  
 ساتھ بغض و عناد سے محفوظ رکھے۔

۱۲ بزرگوں سے بغض و عناد؟ - بزرگوں سے بغض و عناد سے مراد اگر فوت شدہ  
 بزرگوں کو زندہ تسلیم نہ کرنا، اور تصرف فی الامور یا الوہبیت میں انہیں خدا کا شریک و ہم  
 سمجھنا ہے تو ہم واقعی اپنے اس "جہم" کا اقرار کرتے ہیں۔ تاہم ایک بات پوچھنے کا حق ضرور  
 رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ آخر خود رسول اللہؐ کو ان بزرگوں سے کیا بغض و عناد تھا، جن کے  
 مقبرے، مدفن اور مزارات کو آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر حکماً مسمار کرایا تھا، کیا ان  
 کی وجہی نہ تھی کہ وہ لوگ ایسے ہی عقائد میں مبتلا تھے؟

مولانا موصوف کے اس استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے واضح کیا جائے گا۔  
پہلے اس بارے میں اقوالِ مفسرین پیش کیے جائے ہیں۔

امام ابن کثیر فرماتے ہیں ای لا اصل ممن يدعو من دون  
الله اصناما و يطلب منها ما لا تستطيع الی يوم  
القيامة و هي خافلة عما يقولون لا تسمع ولا تبصر  
ولا تبطلش لا نهاجا و حجارة صم۔ جلد ۴ ص ۱۵۶

ترجمہ۔ یعنی کوئی اس شخص سے زیادہ گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ بتوں کی  
عبادت کرتا ہے اور ان سے ایسے امور کی استدعا کرتا ہے جن کی قیامت تک  
ان میں استطاعت و قدرت نہیں اور وہ ان کے اقوال سے غافل ہیں، نہ سنتے  
اور دیکھتے ہیں اور نہ ہی پکڑ سکتے ہیں کیونکہ وہ بے جان پتھر ہیں اور قوتِ سماعِ عاری  
۲ تفسیر خازن میں ہے من لا يستجيب یعنی الاصنام لا تجيب عابديها  
الی شیء یسئلونها۔

ترجمہ۔ من لا يستجيب سے مراد بت ہیں جو اپنے عابدوں کو وہ اشیا  
مہیا نہیں کر دیتے جن کا وہ مطالبہ کرتے ہیں۔ تفسیر جلالین میں بھی اسی سے ملتی جلتی  
تفسیر ہے۔

۳ تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ میں سے (الی يوم القيامة) و  
انما جعل ذلك غایة لان يوم القيامة قد قیل انہ تعالیٰ یجلیہا  
وتقع بینہما و بین من یعبدها مخاطبة فلذلك جعلہ  
حدا و اذا قامت القيامة وحشر الناس فہذہ الاصنام  
تعاذی ہو لاء العابدین و تتبرع منہمہ جلد، ص ۴۷

ترجمہ۔ مجبوراً ان ہاتھ کے جواب نہ دینے کی صدیومِ القیامت مقرر فرمائی (جس سے  
لازم آئے گا کہ قیامت کے دن وہ ان کو جواب دیں گے۔ حالانکہ بت تو قیامت  
کے دن بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ رازی نے  
فرمایا) کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو زندگی بخشے گا اور ان کے درمیان  
اور مشرکین کے درمیان گفتگو ہوگی۔ لہذا جواب نہ دینے کی صد قیامت کا دن بنادیا  
اور جب قیامت قائم ہوگی، تمام لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، تو یہ بت



اپنے مابدول کے دشمن بن جائیں گے، ان سے اور ان کی عبادت سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اس کے علاوہ دیگر کتب تفاسیر میں بھی اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے

اور من لا یستجیب لہ الا یوم القیامت وہم عن دعاہم غفلون  
کے صدق صرف اصرام و اوٹان کو بنایا گیا ہے۔

کیلائی صاحب کے استدلال کا بطلان و فساد قرآن حکیم سے  
حضرت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ انکم وما تعبدون من دون  
اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون۔

ترجمہ۔ بے شک تم خود اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو سب  
کے سب جہنم کا ایندھن ہیں اور تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

اس آیت مبارکہ میں شریکین مکہ کو خطاب ہے اور بقول کیلائی صاحب یہ  
عبادت بزرگوں کی ہے جس میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام سبھی شامل ہیں تو ان کا

فلا من دون اللہ سے مراد؟ چودھری صاحب بعض سماع کے قائل مغیرین کے قول سے  
ثابت فرماتے ہیں کہ من دون اللہ سے مراد صرف بت میں حالانکہ قرآن و حدیث میں بے شک آیتہ بن  
دون اللہ کو ہیں مثلاً شمس و بصری (ستارہ) اصرام، اوٹان، طاغوت، جن، ملائکہ انبیاء  
اور اولیاء۔ آیت بالا میں وَاذْخِرْنَا الْاَناسَ کے الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں  
من دون اللہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے جنہیں پکارا جاتا تھا نہ کہ پتھر کے اصرام کی بہار اس بات  
پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن پتھروں کے اصرام کو اکٹھا کر سکتا اور انہیں قوت گویائی بخش سکتا  
ہے مگر جب اس آیت میں ایسا کوئی قرینہ ہی نہیں تو محض قدرت الہی کا سہارا لے کر یہاں من دون  
اللہ صرف اصرام مراد لینے کی کیا تمک ہے۔ سماع کے قائل حضرات دراصل انبیاء و اولیاء کو عن  
دعاہم غفلون کے معنی قرار دینا چاہتے ہیں مگر کتاب و سنت اس سے ابا کرتے ہیں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے پوچھیں گے: کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ  
مجھے اور میری ماں کو من دون اللہ بنا نا؟ اس سوال کا جواب کا یہ جواب ہے  
کہ جب تک میں ان میں تھا۔ ان کے حالات سے باخبر رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھایا تو ان کا  
گول تو بنے (۱) اب اگر عیسیٰ جیسے اولو العزم پیغمبر جنہیں موت آئی ہی نہیں اور بحد غفری آسمان  
پر زندہ ہیں عن دعاہم غفلون کا خود اقرار کر رہے ہیں تو دوسروں کے لیے یہ بات کیسے تسلیم کی جاسکتی

جہنم میں داخل ہونا اور نار دوزخ کا ایندھن بننا لازم۔ نعوذ باللہ منہ۔ جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی محبوب ہستیوں سے متعلق فرماتا ہے۔ **الہ ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔**

ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی غمگین ہوں گے۔

ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ **ان الذین سبقت لہم منا الحسنی اولئک عنہا مبعدون لا یسمعون حسیہا وہم فیما اشتہت انفسہم خالدون لا یحزنہم الفزع الاکبر و تتلقاہم لہملا ثکۃ ہذا ۱ یوم مکرم الذی کنتہم یوعدون۔** ترجمہ۔ تحقیق وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے۔ وہ نار جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ نار جہنم کی آواز ذرہ بھر بھی نہ سنیں گے اور اپنی پسندیدہ نعمتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے انہیں سب سے بڑی گھبراہٹ (دہشت قیامت وغیرہ) غم میں نہیں ڈالیں گے اور فرشتے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ ہے وہ دن جیسا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

تفسیر ابوالسود میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ ”انکم وما تعبدون من دون اللہ حسب جہنم انتم لہا واردون لو کان ہو لاء الہۃ ماورد و ہا رکل فیہا خلدون۔“

اے مشرکین تم اور تمہارے معبودان باطلہ جہنم کا ایندھن ہیں اور تم سب اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر تمہارے معبود درحقیقت الہ ہوتے تو دوزخ کی آگ میں داخل نہ ہوتے۔ اور یہ سب ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، کو مشرکین پر تلاوت کیا تو ابن زبیری نے کہا کہ ہمارے بت اور اصنام اگر جہنم میں داخل ہوں گے، تو عیسائی حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں

عہ آتش۔ قرآن مجید کی آیات تک غلط کھودی ہیں۔ صحیح الفاظ یہ ہیں، **وَسَنُلَاقُہُمْ اَلنَّارَ**

اور یہودی حضرت عزیرؑ کی پرستش کرتے ہیں اور نبی علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں۔ لہذا وہ بھی جہنم میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان بد باطنوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ یا دوسرے اولیاء اور شہداء اور صلحاء کے لیے ہماری طرف سے وعدہ خیر اور پیمان جود و عطا ہو چکا ہے۔ لہذا ان کا یہ انجام نہیں۔ یہ صرف تمہارے معبودات باطلہ اور ارباب من و دن اللہ کا انجھام بنا اور عاقبت قلیحہ ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ اصنام و انصاب اور صور و تماثل کے حق میں وارد آیات کا انبیاء کرام رسل عظام اور اولیاء شہداء اور صالحین پر چسپاں کرنا محض جہالت اور قرآن و سنت کی قبیح ترین تحریف ہے بلکہ قرآن مجید فرقان حمید کی بہت سے آیات سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے۔

### ۱۰ معبودان باطل اور بزرگ ہستیاں۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی نبی، رسول، شہید اور صالح کی عبادت کی ہے تو اس آیت ”اَتَاكُمْ وَمَا نَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبٌ جَعَلْتُمْ“ کے بموجب یہ بزرگ ہستیاں معبودان باطل کی غفلت سے مستثنیٰ ہی رہیں گی۔ البتہ ان کو پوجنے والے ضرور جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم، لیکن اس سے سماع موتی کیسے ثابت ہو گیا؟ یہ عقدہ ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ شاید اس پر موصوف کچھ روشنی ڈال سکیں۔ اس سے تو الٹا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو سماع موتی کو درست سمجھ کر انہیں پجارتے رہے یا عبادت کرتے رہے ہیں ان کو ان کے اس جرم کی سزا یہ ملے گی کہ وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ یہی یہ بزرگ ہستیاں تو چونکہ ان کا اپنا کوئی قصور نہیں، لہذا انہیں دوزخ سے دور رکھا جائے گا اور جو بتوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو وہ بھی محض مشرکین کے اس زعم باطل کی تردید اور مزید حسرت و یاس کے احساس دلانے کے لیے ہو گا۔ ورنہ پتھر کے بتوں کا اپنا کیا قصور ہو سکتا ہے اور جہنم میں داخل کر لے سے انہیں کیا نقصان پہنچے گا؟

جناب محمد علی صاحب کلعتے ہیں:

”بلکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے“

ثبوت نمبر۔ قال اللہ تعالیٰ واسئل من ارسلنا من قبلك  
من رسلنا انجعلنا من دون الرحمن الہمة یعبدون۔

ترجمہ۔ وہ رسول و نبی جو ہم نے آپ سے پہلے مبعوث فرمائے ان سے  
پوچھ لیجئے کیا ہم نے ذات رحمن جل و علیٰ کے بغیر کئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی  
عبادت کی جاتے یقیناً ایسا نہیں ہے۔

اگر انبیاء کرام میں حیات نہ ہوتی وہ خطاب و ندا کو نہ سمجھتے تو حق تعالیٰ اپنے  
محبوب کو دریافت کرنے کا حکم نہ فرماتا۔ تفسیر کبیر جلد سابع ص ۴۳ پر ہے عبد اللہ  
ابن عباس سے مروی ہے کہ جب سب اسراہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو  
مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد  
میں سے تمام رسولوں کو آپ کے لیے مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا۔ حضرت جبرائیل  
علیہ السلام نے اذان دی اور اقامت کی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
آگے بڑھیے اور نماز پڑھائیے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت جبرائیل  
نے عرض کیا ان رسولوں سے جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے سے دریافت  
کر لیجئے (جیسا کی آیت میں ہے) آپ نے فرمایا لا اسئال لانی لست  
نشا کا فیہ۔ میں نہیں پوچھتا مجھے کوئی شک نہیں۔

ثبوت نمبر۔ قال اللہ تعالیٰ۔ وقالوا یا صالح ائتنا بما تعدنا  
ان کنت من المرسلین فاخذ ترہم الرجفۃ فاصبحوا فی  
دارہم جثمین فتولی عنہم وقال یقوم لقد ابلغتکم رسالۃ  
ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین۔

اب درج بالا آیت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کی تو ہم نے وضاحت  
کر دی ہے۔ باقی جو آیات درج فرما کر آپ نے ثبوت پیش کیے ہیں وہ واسئل  
کے الفاظ سے شروع ہونے والی آیت کے علاوہ صرف ایک مزید آیت ہے  
جو ۱۹ کے تحت زیر بحث آرہی ہے۔  
۱۰ اس آیت پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔

ترجمہ۔ (قوم صالح علیہ السلام نے ان سے کہا) اے صالح جس عذاب کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے وہ ہمارے پاس ہے آ، اگر تو درحقیقت مرلین میں سے ہے۔ تو زلزلہ نے انہیں اپنے گھر سے میں لے لیا۔ پس وہ لوگ اپنے گھروں میں تباہی بربادی سے دوچار ہو گئے اور علیحدہ ہوتے وقت ان سے مخاطب ہو کر کہا اے میری قوم میں نے تمہیں رب کے پیغام پہنچائے اور نصیحت کی، لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

امام رازی نے تفسیر میں فرمایا۔ ”پہلا قول یہ ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی علیحدگی ان کی ہلاکت کے بعد پائی گئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ فاتعقب اور فری ترتیب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اعراض ہلاکت کے بعد متحقق ہوا اور انہوں نے قوم کی ہلاکت کے بعد انہیں خطاب فرمایا جیسا ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مقتول کو خطاب فرمایا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ ان مردوں کے ساتھ کلام فرما رہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں لیکن وہ لوگ ایسے جواب پر قادر نہیں جو تم سن سکو۔ جلد رابع صفحہ ۲۵۵ قال ابو السعود مخاطبہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بذلک خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اهل قلبہ بدر حدیث قال انا وجدنا ما زعدنا ربنا فہل وجدتم ما وعدکم بحقا۔ جلد رابع صفحہ ۲۱۸ علامہ ابو السعود فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی ہلاکت شدہ قوم کو ایسے

ہلہ نہ ہمیں قلب بدر کے واقعہ سے انکار ہے نہ ان مفسرین کی تفسیر سے۔ یہ سب صورتیں سحجرہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اشعث کی صورت میں ہیں۔ لہذا ان واقعات سے علی الاطلاق سماع موثی ثابت کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس بات سے آخر کے انکار ہے کہ اللہ جب چاہے مردوں کو سنا سکتا ہے۔ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ آیا ہم لوگ بھی مردوں کو سنا سکتے ہیں؟ یا عام حالات میں وہ ہماری بات بھی سن سکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ واقعات ایسا ثبوت عیا نہیں کرتے۔ بلکہ الشاقر آنی نصوص اس کا رد ضرور ثابت کرتی ہیں۔

ہی خطاب فرمایا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کے کنوئیں میں پھیلے ہوئے کفار سے خطاب فرمایا۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد خطاب فرمایا۔  
ثَبُوتٌ مُّثَلَبٌ - وَالنَّازِعَاتُ غُرُقًا وَالشَّاسِطَاتُ نَشِطًا وَالسَّابِحَاتُ  
سَبْحًا فَالْسَّابِقَاتُ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرَاتُ أَمْرًا۔

قسم ہے ان نفوس قدسیہ کی سختی سے جان کھینچیں اور نرمی سے بند کھولیں اور آسانی سے تیریں پھر آگے بڑھ کر جلد پہنچیں، پھر کام کی تدبیر کریں۔

مفسرین کرام نے صفات مذکورہ کو ملائکہ کے علاوہ نفوس کاملہ اور ارواح فاضلہ پر بھی منطبق فرمایا ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں "آیت مذکورہ میں ان نفوس فاضلہ کے ساتھ قسمیں ذکر کی گئی ہیں جو موت کی دہرے سے ابدان سے بزور انگٹھ کیے جاتے ہیں کیونکہ بدن سے الفت و محبت کی دہرے سے ان کی جدائی

قُلْهُ وَالنَّازِعَاتُ غُرُقًا کی تفسیر جو اپنے روح المعانی کے حوالہ سے پیش فرمائی ہے۔ یہ تفسیر بالماثور کے خلاف ہے۔ صحابہؓ اور تابعینؓ سب نے یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں نہ کہ نفوس فاضلہ۔ اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ کثر الایمان کے حاشیہ نویس جناب نعیم الدین صاحب مراد آبادی نے بھی یہاں فرشتے ہی مراد لیے ہیں کیونکہ فرشتے ہی جسم میں دُوب کر جان کو کھینچ نکالتے ہیں اور مدبرانِ امر بھی فرشتے ہی ہیں۔ یہاں جناب محمد علی صاحب نے جن چند مفسرین کے نام روح المعانی کی تائید میں پیش فرماتے ہیں یہ سب تصوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں ہر وقت یہ فکر دامگیر ہوتی ہے کہ جہاں تک بن پڑے فوت شدہ اولیاء اللہ کا تصرف فی الامور بھی کسی طرح کتاب و سنت سے ثابت کیا جائے۔ روح المعانی کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ آپ معانی کی روح کھینچ کر ایسی تفسیر بیان فرماتے ہیں۔ متصوفین حضرات ظاہری معانی کو پہنچ سمجھ کر بعینہ باطنی معانی کی دریافت میں اپنی کوششیں صرف کیا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جو تفسیر صاحب روح المعانی نے پیش فرمائی ہے آیا قرآن کریم کے الفاظ ان معانی کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟

بہت مشکل ہوتی ہے۔ جبکہ بدن اعمال خیر میں ان کے لیے بمنزلہ سواوی کے ہوتا ہے اور بدن میں رہنا مزید خیر و برکت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تب وہ بدنوں سے جدائی کے بعد عالم ملکوت کی طرف بصد شوق گامزن ہوتے ہیں اور عالم ملکوت میں

صاحب روح المعانی کے مطابق آیات نمبر (۱) اور (۲) کے معنی یا تفسیر یہ ہے:

”وَالنَّفْسُ غَرِقَتْ غَرَقًا وَٱلنَّفْسُ طَلَتْ نَشْطًا“

”ان نفوس فاضلہ کی قسم جو موت کی وجہ سے بدن سے بزور الگ کیے

جاتے ہیں۔ کیونکہ بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت

مشکل ہوتی ہے۔“

اب دیکھتے درج بالا ترجمہ یا تشریح پر درج ذیل اعتراضات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ”نَفْسٌ“ فعل متعدی بمعنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنا ہے (مفردات)

”نزع بمعنی جان کنی کا وقت ہے اور غرق فعل لازم بمعنی کسی چیز کا ڈوبنا ہے۔

اب اگر یہاں نازعات اسم فاعل بمعنی کھینچنے والیاں (دارد و معادہ کی نسبت

سے کھینچنے والے) سے مراد فرشتے لیے جائیں۔ تو آیت کا مطلب بالکل واضح

ہو جاتا ہے کہ فرشتے انسان کے جسم میں ڈوب کر اس کی روح کو نکالتے ہیں

اور یہی بات کتاب و سنت سے بھی ثابت و مسلم ہے۔ لیکن اگر یہاں فرشتوں

کے بجائے نفوس فاضلہ مراد لیے جائیں تو وہ تو پہلے ہی اپنے اجسام میں موجود

ہوتے ہیں۔ ان کے کسی دوسری چیز میں ڈوبنے اور اس کو اس کی قرار گاہ سے

کھینچنے کی کیا تمک ہے؟

۲۔ قرآن نے نازعات اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ بمعنی کھینچنے والے

یا دالیاں۔ لیکن روح المعانی نے اس کا ترجمہ بصورت مفعول ”بدن سے بزور

الگ کیے جاتے ہیں“ کیا ہے جو اگر امر کے لحاظ سے غلط ہے۔

۳۔ ”وَالنَّفْسُ طَلَتْ نَشْطًا“ فرشتے تو انسان کے جسم کے بند بند اور جوڑ جوڑ

سے جان نکال لاتے ہیں لیکن نفوس فاضلہ جو پہلے ہی جسم میں موجود ہوتے ہیں

اور بدن سے اُلفت و محبت کی وجہ سے ان کی جدائی بہت مشکل ہوتی ہے۔“

وہ کیسے بند بند کو کھول سکتے ہیں؟ کیا بدن سے اُلفت و محبت کا تقاضا یہی ہے؟

پرداز کرتے ہوئے بارگاہِ قدس میں سبقت لے جاتے ہیں، تب اپنے مرتبہ و درجہ اور قدرت و طاقت کی وجہ سے کارکنانِ قضا و قدر میں سے ہر جاتے ہیں۔ تفسیر روح المعانی ص ۲۲ جلد ۳ مطبوعہ مہران۔ علامہ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "لا ینبغی التوقف فی ان اللہ قد یکرم من شاء من اولیاءہ بعد الموت کما یکرمہ قبلہ بما شاء فیبرئ سبحانہ المریض وینقذ الغریق وینصر علی العدو وینزل الغیث وکیت وکیت کرامۃ لہ۔ روح المعانی جلد ۳۰ ص ۲۵۔

ترجمہ۔ اس امر میں توقع و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے اولیاء کو وصال کے بعد بھی کرامتوں سے نوازتا ہے، جیسا کہ حالتِ حیات میں پس بھی مریدوں کو ان کے ہاتھ پر بطور کرامت شفا بخشتا ہے۔ بھی کسی کو غرق ہونے کے وہ اس کے بند بند کو خود ہی کھولنا شروع کر دیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ صاحب روح المعانی نے "وَالنَّشِطَاتِ نَشْطًا" کا ترجمہ یا تفسیر ہی چھوڑ دی اور اس کے بجائے جو فقرہ درج فرمایا کہ ان نفوسِ فاضلہ کو بدن سے الفت و محبت کی وجہ سے جدائی بہت مشکل ہوتی ہے؟" یہ دراصل ان کی اپنی طرف سے پہلی آیت کی مزید تشریح و تفسیر ہے۔

۴۔ جن نفوس کو اپنے بدن سے اتنی الفت و محبت ہو وہ فاضلہ ہو کیسے سکتے ہیں؟ عام نفوس کو تو فی الواقعہ بدن سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن نفوسِ فاضلہ کو بدن سے ایسی محبت قطعاً نہیں ہوتی۔ یا پھر ایسے نفوسِ فاضلہ ہوتے ہی نہیں۔ ترجمہ میں نفوسِ فاضلہ کے اضافہ کے فوائد۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ اہل طریقت حضرات "قَالُمَا تَرَکَاتِ اَهْرًا" میں اپنے مرعومہ "اولیا۔ اللہ" کو شریک بنانا چاہتے ہیں۔ لہذا انہوں نے پہلی آیت سے نفوسِ فاضلہ کا لفظ شامل کر کے اس کے لیے بنیاد ہموار کرنا شروع کر دی۔ اور تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ "اس امر میں توقع و تردد کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے "اولیاء" کو مرنے کے بعد بھی کرامتوں



سے بچاتا ہے کبھی دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے تو کبھی ان کے عرض کرنے پر بارش برساتا ہے وغیرہ

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی - حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی - علامہ اسماعیل حقی - امام فخر الدین رازی قاضی ثناء اللہ دہلوی تہی صاحب تفسیر نظری نے بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر بیان کی ہے۔

ثبوت سماع موتی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے !  
۱۔ سماع موتی کے باب میں قلیب بدر والی حدیث مشہور و معروف ہے۔ جو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت ابوطحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے کبار صحابہؓ سے مروی ہے۔ ان کی روایات بخاری مسلم شریف میں موجود ہیں۔

۲۔ ثبوت جوتیوں کی آہٹ کی آواز سنتا ہے۔ یہ حدیث بھی سماع موتی پر

سے نوازتا ہے جیسا کہ حالت حیات میں

سوچنے کی بات ہے کہ وفات نبوی کے وقت چار لاکھ کے قریب مسلمان موجود تھے اور سو لاکھ توجہ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور یہ دور صحابہ کرامؓ سلسلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اب ان چار لاکھ صحابہ کرامؓ سے پورے سو سال کے عرصہ میں صرف بارہ کرامات مذکور ہیں۔ پھر ان بارہ میں سے بھی بعض روایات ضعیف و مجروح ہیں۔ لیکن ہمارے ان اولیاء اللہ میں سے ہر ایک ولی کی زندگی کرامات سے بھرپور ہوتی ہے۔ پھر مرنے کے بعد بھی ان کی کرامات سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے۔ تو کیا ان اولیاء اللہ کے نفوسؓ صحابہ کرامؓ سے بہت زیادہ فاضلہ ہیں جن کی کرامات اور تصرف فی الامور کا یہ عالم ہے۔ !

۳۔ قلیب بدر اور مردہ کے عجوتوں کی چاپ سننے والی احادیث :

یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور ان پر میں پہلے بھر لو پڑ بحث کر چکا ہوں۔ ان میں پہلی حدیث معجزہ سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ایک اضطراری امر

دلائل کرتی ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت برابر بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

۳۔ اخرج الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرو واخرج الحاكم وصححه والبيهقي عن ابو هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم انه وقف على مصعب بن عمير حين رجع من احد فوقف عليه وعلى اصحابه فقال اشهد انكم احياء عند الله فنزروهم وسلموا عليهم فوالذي نفسي بيده لا يسلم عليهم احد الا ردوا عليه الى يوم القيامة

(شرح الصدور ص ۸۵)

ترجمہ طبرانی نے اوسط میں عبد اللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور حاکم و بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب احد سے مراجعت فرما ہوئے تو حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے مزارات پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہو۔ پھر اپنے اہل بیت صحابہ کرام اور بعد میں آنے والوں کو حکم فرمایا کہ ان شہداء کرام کی زیارت کرو اور

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی کثیر تعداد ان حدیثوں کو جاننے کے باوجود علی الاطلاق سماع موثق کی منکر ہے۔

۳۱۔ طبرانی، حاکم اور بیہقی تیسرے درجہ کی کتب احادیث ہیں؛ طبرانی، حاکم اور بیہقی تینوں کتابیں تیسرے درجہ کی ہیں۔ ان سے اگر جواز ثابت ہو بھی جائے تو قابل احتجاج نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بالوضاحت لکھ چکا ہوں۔ کہ احادیث میں سے تیسرے اور چوتھے درجے کی احادیث سماع کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ صحاح ستہ میں سے بخاری اور مسلم اول درجہ کی، باقی چار کتابیں درجہ دوم کی ہیں۔ اور ان کے علاوہ باقی تمام کتب احادیث درجہ سوم اور چہارم کی ہیں۔

ان پر سلام بھیجو، مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جو شخص نبی قیامت تک انہیں سلام دے گا یہ شہداء کرام اس کا جواب دیں گے۔

اس روایت سے شہداء کا زائرین کو ماننا سلام سنا، جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ جب شہداء میں یہ چیز ثابت ہو گئی تو اولیاء کاملین صدیقین اور انبیاء کرام میں بطریق اولیٰ ثابت ہو جائے گی کیونکہ فضیلت میں شہداء تیسرے نمبر پر ہیں۔ کیا کیلا فی صاحب کونبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے بعد کھی اور کی شہادت بھی درکار ہے؟  
سماع موفی اور صحابہ کرامؓ

۴۔ روی ابن عبد البر بسند صحیح ما من احد یمر بقبر اخیه المؤمن کان یعرفه فی الدنیا فیسلم علیہ الا عرفہ ورد علیہ السلام صححہ عبد الحق ورواہ ابن عبد البر فی الاستذکار و التمهید عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ (شرح الصدور ص ۸۴، طحطاویؒ ص ۳۶)

ترجمہ۔ ابن عبد البر نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ کوئی شخص بھی جب اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جسے صاحب قبر دنیا میں جانتا تھا۔ پس سلام دیتا ہے تو صاحب قبر اسے پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اس روایت کو محدث عبد الحق نے صحیح کہا اور ابن عبد البر نے استذکار و تمہید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۵۔ یہ حدیث موضوع ہے۔

یہ حدیث جو شرح الصدور اور طحطاوی کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے موضوع ہے۔ اور اسے میں موضوع حدیث ۷۲ کے عنوان کے تحت ص ۵۴ اور ۵۵ پر زیر بحث لاچکا ہوں۔ اور محدث عبد الحق صاحب کے نزدیک تو ایسی روایات بہر حال صحیح ہی ہونی چاہئیں۔

۵۔ روی مسلم عن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال لا بنہ وهو فی سیاق الموت اذا انامت فلا تصبہی ناحتہ ولا نار فاذا دفنتہونی فشنرہ علی التراب شنائم اقیہوا حول قبری قدر ما ینحر جزرہ و یقسم لحدہ حتی استانس بکم واعلم ما اذا ارجع بہ رسل ربی مشکوٰۃ شریف ص ۱۳۷ باب دفن المیت۔

ترجمہ۔ مسلم شریف میں حضرت عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ جب وہ قریب المرگ تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا جب میں فوت ہو جاؤں تو کوئی نوحہ کرنے والی عورت میرے ساتھ نہ چلے اور نہ آگ میرے ہمراہ لائی جائے (جیسا کہ رسم جاہلیت تھی) جب مجھے دفن کر چکو تو مجھ پر آہستہ آہستہ مٹی ڈالنا پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاسکتا ہے تاکہ میں تم سے انس حاصل کروں اور پورے وثوق کے ساتھ اپنے رب کے بھیجے ہوئے ملائکہ کو ان کے سوالوں کا جواب دے سکوں۔

۳۳ حدیث صحیح ہے لیکن استنباط غلط

یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر اس کا جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے، وہ درست نہیں۔ کیونکہ یہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا اپنا خیال اور تدبیر تھی۔ اور یہ ویسا ہی خیال اور تدبیر تھی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کو تاکید کی تھی کہ جب مصر پہنچو تو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔ اس پر اللہ رب العزت نے فرمایا:

”مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَتَهُ فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا“ (یوسف ۶۸)

”وہ تدبیر خدا کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوبؑ کے دل کی بس خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔“

(ترجمہ فتح محمد جالندھری)

حضرت عمرو بن العاص نے یہ وصیت اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرو کو کی اور حضرت عبداللہ نے اسے خلافِ قرآن و سنت نہ سمجھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اہل قبور کا زائر کو جاننا پہچاننا اور اس حاصل کرنا مشہور و معروف تھا ورنہ ان کے صاحبزادے جو خود بھی ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ضرور کہتے کہ آپ تو وہاں بے جان لاش ہوں گے میرے وہاں ٹھہرنے کا کیا فائدہ؟

اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی مختلف کتب احادیث میں سماع موتی کی تئید روایات موجود ہیں۔

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سماع موتی حضرت ام المؤمنین کے انکارِ سماع پر ایک نظر

مولانا کیلانی صاحب نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو بنیاد بنا کر مقتولین بدر اور سماع موتی پر دلالت کرنے والی تمام روایات کو مردود اور ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے اور ان کی روایت قبول کرنے کا سبب ان کا نفع نہ بتایا ہے۔ موصوف کا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے استدلال چند وجوہ کی

توجس طرح حضرت یعقوب کی یہ تدبیر مشیتِ الہی کے مقابلہ میں بے اثر ہونے کے باوجود شریعت کے منافی نہ تھی۔ بالکل یہی صورت حضرت عمرو بن العاص کی تدبیر کی ہے جو انہوں نے محض اپنی دلچسپی کے واسطے بتلائی۔ یہ تدبیر بھی کتاب و سنت کے منافی نہیں تھی۔ تاہم یہ مطابق بھی نہ تھی۔ کیونکہ اگر مطابق ہوتی تو اکیلے حضرت عمرو بن العاص کا کیا ذکر بہت سے صحابہ کرام ایسی وصیتیں کر جاتے بلکہ خود حضور اکرمؐ نے ”لَقِنْتُمَا مَوْتَاكُمَا“ کا ارشاد فرمایا تھا، اسی طرح اس موانست کے لیے بھی کوئی ارشاد فرمادیتے۔

پھر یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے یہ بات سکراب موت کی بحرانی کیفیت میں کہی اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے بیٹے عبداللہؓ نے اس وصیت پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟

بنائے پر غلط ہے۔  
 اول حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اپنے اجتہاد و استنباط پر  
 مبنی ہے۔

دوم۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ ضابطہ و قاعدہ بیان فرمایا ہے  
 کہ جس کو واقعہ کا مشاہدہ ہے اس کا قول راجح و مختار ہے۔ مسلم شریف میں ہے  
 کہ حضرت شریح ابن بانی نے حضرت ام المؤمنین سے مسج خفین کی مدت سے  
 متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔

علیت ہا بن ابی طالب فاساء لہ کان یسا فر مع رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی روایۃ علیاً فانہ اعلم بذالت  
 منی۔ مسلم جلد اول ص ۱۳۵

ترجمہ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دریافت  
 کر وہ سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور دوسری  
 روایت میں ہے کہ انہیں اس معاملہ میں مجھ سے زیادہ علم ہے۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جس کو واقعہ کا علم زیادہ ہے اسی کا قول معتبر  
 ہے اور اس کا علم دوسروں سے بہر حال زیادہ ہے جو موقع پر موجود ہو۔  
 چونکہ بذریعہ صحابہ موقع کے گواہ ہیں اور خود آنحضرت کے سامنے تعجب  
 کا اظہار کرنے حقیقت حال دریافت کرنے والے ہیں لہذا انہیں کا قول

۲۳ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سماع موتی سے انکار کی  
 بنیاد، اجتہاد و استنباط،

حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول اگر آپ کے اپنے اجتہاد و استنباط  
 پر مبنی ہے، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی اپنے اجتہاد و استنباط ہی کی بنا پر  
 سماع موتی کے قائل تھے۔ گویا وہاں بھی بات اجتہاد و استنباط ہی کی ہے!  
 ۲۵ موقع کے گواہ:

چوہدری صاحب نے روح المعانی کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ ام المؤمنین  
 حضرت عائشہ صدیقہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت  
 موجود نہ تھیں۔

معتبر ہے۔

علامہ محمود آلوسی صاحب روح المعانی فرماتے ہیں "امام سہیلی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب کے وقت موجود نہ تھیں لہذا ان کے علاوہ جو صحابہ کرام وہاں موجود تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہیں۔ ترجمہ جلد ۲۱ ص ۵۰۔

سوم۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت "کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مقتول اس کو سن رہے ہیں" کے جواب میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا "کہ یہ مردار جانتے ہیں کہ جو کچھ میں انہیں کہا کرتا تھا وہ سچی ہے۔ محدثین نے فرمایا کہ دونوں روایتوں میں مخالفت نہیں ان کے لیے علم ممکن ہے تو سماع بھی ممکن ہے۔ منکرین سماع حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ قلیب بدر پر تشریف لے گئے اختلاف ہے تو صرف اس میں کہ حضور علیہ السلام

لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بھی قلیب بدر کے واقعہ کے وقت خود موجود نہیں تھے۔ ان کو جنگ بدر اور جنگ احد دونوں ہوا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم ہستی کی بنا پر جہاد میں شرکت کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ انہیں پہلی مرتبہ جنگ خندق میں شمولیت کی اجازت ملی اور اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی (دائرة المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۲ ص ۸۰) یہ عنوان عبد اللہ بن عمرؓ

نص میں اجتہاد نہیں۔

پھر موقع کے گواہ کے ضمن میں چودھری صاحب نے جو حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے مثال پیش فرمائی ہے وہ قیاس مع الفارق ہے۔ رسول اللہ کا مسح علی الخفین کی مدت متواتر نص ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں جبکہ سماع موثقی کا مسئلہ ایک اجتہاد ہی مسئلہ ہے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اجتہاد دوسرے صحابہ کرام کے اجتہاد سے مختلف تھا۔

نے صحابہ کرام کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کیا الفاظ فرمائے۔

چہارم۔ حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اگرچہ پہلے سماع کی نفی فرمائی لیکن بعد میں رجوع کر لیا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”تحقیق ذکر کردہ است در مواہب لدنیہ کہ در مغازی محمد بن اسحاق با سند جدید و در سند امام احمد بن حنبل با سند حسن از عائشہ رضی اللہ عنہا مثل حدیث عمر رضی اللہ عنہ آمدہ۔ پس گویا عائشہ (رضی اللہ عنہا) رجوع کو از

۵۲۶۔ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نہ تو حضرت عائشہؓ موقعہ پر موجود تھیں اور نہ محمدؐ بن عمرؓ، تو اب ہمیں لامحالہ قتادہ عن انس بن مالک عن ابی طلحہ کی روایت اور ان کے استنباط پر انحصار کرنا پڑے گا۔ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں رسول اللہؐ نے جو الفاظ بیان فرمائے تھے، وہ یہ ہیں:

”مَا اَنْتُمْ بِاسْمَعِ لِمَا اَقُولُ مِنْهُنَّ“ (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی جہل)

یعنی ”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ مڑے بھی ایسے ہی سن رہے ہیں جیسے تم سن رہے ہو“

اور حضرت قتادہ کا یہ استنباط بھی سماع موتی کے سلسلہ میں چندال مفید نہیں۔ کیونکہ ان الفاظ سے واضح ہے کہ یہ معجزہ کی صورت ہے۔

۵۲۷۔ سماع موتی کے انکار سے حضرت ام المؤمنینؓ کا رجوع؟

یہ عبدالحق محدث صاحب کا اپنا خیال ہے۔ کوئی حدیث تو درج نہیں فرمائی، بس چند کتابوں کے نام گنوا دیے ہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا سماع موتی سے انکار تو بخاری سے ثابت ہوا، لیکن رجوع مواہب لدنیہ اور مغازی محمد بن اسحاق جیسی کتابوں سے؟ — ہاں اگر وہ کوئی حدیث درج فرما دیتے تو مسند احمد بن حنبل کی طرف رجوع کیا جاسکتا تھا۔



انکار سبب آنچہ ثابت شود نزد وے از روایت ثقات صحابہ کبار زیرا کہ وے  
رضی اللہ عنہا حاضر نبود در آن قفیفہ و در شرح مسلم نیز مثل ایں مذکور شد۔  
مدارج النبوت، اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ جلد سوم ص ۴۲۲

### باب سماع میں حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایات

۱۔ اخرج ابن ابی الدنیا فی کتاب القبور عن عائشۃ رضی اللہ  
عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من رجل  
یزور قبر اخیه ویجلس عنده الا استأنس به وروی علیہ حتی  
يقوم۔ شرح الصدور ص ۴۸

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا نہیں کوئی ایسا شخص جو کہ اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے  
اور اس کے پاس بیٹھتا ہے مگر اسے اس کے ذریعہ انس اور راحت و سکون میسر  
آتا ہے۔ سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔ اور یہ سکون اس وقت تک حاصل  
رہتا ہے جب تک بیٹھا رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوگا تو یہ حالت  
ختم ہو جائے گی۔

۲۔ عن ابن ابی ملیکہ قال لما توفی عبد الرحمن بن ابی بکر  
رضی اللہ عنہما بالحبشی فحمل الی مکۃ فدفن بہا  
فلما قدمت عائشۃ رضی اللہ عنہا اتت قبر ابن ابی بکر  
فقالت ۛ وکنا کندما فی جذیعۃ حقیقۃ۔ من الدھر حتی  
قیل لن یتصدع فلما تفرقنا کافی و مالکاً۔ لطول اجتماع  
لم نبت لیلۃ معاً۔ ثم قالت واللہ لو حضر تک ما دفنت  
الا حیث مت ولو شہد تک ما دفرتک۔ رواہ الترمذی

۲۸ ابن ابی الدنیا کی روایات،

ابن ابی الدنیا کے متعلق پہلے و مناسحت ہو چکی ہے کہ اس کی روایات  
قابل احتجاج نہیں۔

## مشکوٰۃ شریف (۱۴۹)

ترجمہ - ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ جب عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ مقام جلثے میں فوت ہو گئے تو انہیں وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف منتقل کئے گئے وہاں دفن کر دیا گیا۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ تشریف لائیں تو اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر پر تشریف لائیں اور فرمایا: ہم حذیمہ کے دو صاحبوں کی طرح زمانہ کا ایک طویل حصہ اکٹھے رہے، حتیٰ کہ کہا گیا کہ یہ ہرگز جدا نہ ہوں گے اور جب ہم جدا ہو گئے تو گویا میں اور مالک باوجود عرصہ دراز تک اکٹھے رہنے کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رات بھی اکٹھے نہیں رہے تھے۔

پھر اپنے بھائی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: بخدا اگر میں اس وقت موجود ہوتی جبکہ آپ کا انتقال ہوا تھا تو آپ وہیں دفن کیے جاتے جہاں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت حاضر ہوتی تو اب تیری زیارت نہ کرتی۔ شیخ عبدالحق محدث فرماتے ہیں کہ چونکہ انداز مطہرات کا بغیر کسی ضرورت و مجبوری کے اپنے گھروں سے نکلنا روا نہیں تھا، اس لیے فرمایا کہ میں اگر اس وقت الوداع کر لیتی تو اب زیارت نہ کرتی۔

حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا خطاب اور الوداع کہنے کے لیے قبر پر تشریف لے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت صدیقہ کے نزدیک بھی صاحب قبر کو زائر کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کے کلام کو سنتا ہے۔

## ۵۰ حضرت ام المؤمنینؓ کا اپنے بھائی سے خطاب:

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابوبکرؓ کی قبر کی زیارت کی، جو ان کی عدم موجودگی میں دفن کیے گئے تھے۔ اور قبر پر جا کر تمیم کے دو شعر بھی پڑھے جو اس نے اپنے بھائی مالک کی وفات پر مرثیہ کے طور پر کہے تھے۔ پھر یہ کہا کہ اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو تمہیں اسی جگہ دفن کرتی۔ جہاں تم فوت ہوئے تھے اور تمہاری موت کے وقت میں موجود ہوتی تو تمہاری قبر پر

ترمذی شریعت کی یہ روایت ابن ابی الدنیا کی روایت کی مؤید ہے۔  
امام ترمذی کی صحیح روایت کے بعد یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ امام ابن ابی الدنیا  
ضعیف محدث ہے۔ ویسے جب ذہن میں پہلے ہی ایک غلط معروضہ  
قائم کر لیا جاتے پھر کوئی بھی روایت ہو وہ ضعیف ہوتی چلی جاتے گی۔  
احمد، حاکم کی یہ روایت بھی ان روایات کی تصدیق کرتی ہے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت كنت ادخل البيت  
فاضع ثوبي واقول انما زوجي وابي فلما دفن عمر معهما ما  
بھی نہ آئی۔

اب دیکھیے ایسا خطاب تو لوگ اپنے مرنے ہوئے عزیزوں کو اکثر کیا  
ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ سن نہیں رہے۔ اور  
شاعر حضرات تو ہوا کو مخاطب کر کے اس کے ذمہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی لگا  
دیتے ہیں، صرف مخاطب کرنا تو بڑی آسان بات ہے۔ مثلاً اقبال کہتا ہے کہ  
اے ہمالہ اے فیصل کشور ہندوستان چومتا ہے تیری پیشانی کو جھکے آسمان  
تو کیا اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ ہمالہ پہاڑ بھی  
میرا یہ خطاب سن رہا ہے؟ اس طرح کا طرز خطاب تو محض اپنے جذبات کے  
اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسی باتوں کو عقیدہ کی بنیاد بنانا آخر کہاں تک درست  
ہے؟ اگر آپ نے سماع موتی کو احادیث سے ثابت کرنا ہی تھا تو اس سے تو  
وہ حدیث بدرجہا مفید تھی۔ جس میں مسلمانوں کو قبرستان جا کر سلام دعا کہنے کی  
تعمین کی گئی ہے۔ لیکن اس کا جواب بھی ہم اپنے مضمون میں دے چکے ہیں۔  
ﷺ ابن ابی الدنیا کی ثقاہت؟

ترمذی کی اس روایت سے ابن ابی الدنیا ثقہ راوی کیسے بن گیا؟ ترمذی کی  
روایت ابن ابی ملیکہ کی ہے اور اس میں صرف خطاب ہی خطاب ہے۔ جبکہ  
ابن ابی الدنیا کی روایت یوں ہے کہ مرنے سے صرف سلتے ہی نہیں، جواب  
بھی دیتے ہیں۔ تو جب متن حدیث میں ہی اصولی اختلاف ہو تو ابن ابی الدنیا  
کو کیسے معتبر راوی قرار دیا جاسکتا ہے؟

دخلت۔ الا وانا مشدودة علی ثیابی حیاء من عمر مشکوة  
ص ۱۵۴، شرح الصدور ص ۵۴۔ ترجمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ  
عنہا فرماتی ہیں میں اپنے حجرۂ اقدس میں داخل موتی تھی جس میں رسول خدا علیہ السلام  
آرام فرما رہے تھے تو پردہ کا اہتمام نہ کرتی تھی اور دل میں کہتی تھی یہ تو میرے خاوند  
ہیں اور دوسرے میرے والد ہیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے  
تو بخدا میں بغیر اچھی طرح پردہ و حجاب کیسے ہرگز داخل نہ ہوتی۔ حضرت عمر  
رضی اللہ عنہ سے حیا کرتے ہوئے علیہ السلام

### ۱۔ فوت شدہ بزرگوں سے عورتوں کا پردہ؟

یہ روایت بھی کئی وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے مثلاً :-

۱۔ یہ روایت مشکوة باب زیارت القبور کی تفسیری فصل میں درج ہے اور مشکوة کی تفسیری  
فصل کی بیشتر روایات ناقابل احتجاج ہیں جیسا کہ میں اس کتاب کے ص ۴۷ پر تفصیل  
سے بیان کر چکا ہوں۔ یہ روایت صحاح میں کہیں مذکور نہیں۔ چوہدری صاحب نے خود  
بھی اس کا دوسرا حوالہ شرح الصدور سے دیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی قبور حضرت عائشہؓ کے حجرہ یا گھر میں  
ہی تھیں پھر حضرت عائشہؓ اپنے ہی گھر میں اور کہاں سے داخل موتی تھیں آپؓ  
کا یہ گھر کوئی دو پارکنال کا بنگلہ تو نہ تھا کہ قبور کی طرف آئیں تو پردہ فرمائیں اور وہاں  
سے جانا ہو تو پردہ اٹھالیں۔ آپؓ کے اس گھر کے تقریباً تہائی حصہ میں یہ قبور تھیں، باقی  
جگہ آپؓ کی رانش گاہ تھی۔ قبور کے ساتھ بیرونی دیوار تھی جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔  
ایک عبد اللہ بن عمرؓ ہی ایسے صحابی تھے جو کبھی کبھار حضرت عائشہؓ سے اذن لے کر گھر کے  
دروازہ سے آتے اور تینوں قبور کے پاس کھڑے ہو کر سلام کہتے تھے حضور اکرمؐ کی قبر  
مبارک کو اس طرح نذر رکھنے کی وجہ آپؓ کا یہ فرمان تھا کہ ”میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنانا  
بلکہ دو روز دیک جہاں کہیں بھی تم مجھ پر سلام پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔“  
اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اندازہ کر لیجئے کہ حضرت عائشہؓ کب ایسا سخت پردہ  
کرتی ہوں گی اور کب اٹھاتی ہوں گی؟ ایسا سخت پردہ کرنے سے کیا یہی بہتر نہ تھا کہ  
وہ حضرت عمرؓ کو اپنے گھر میں دفن ہونے کی اجازت ہی نہ دیتیں؟

اس روایت سے حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا نظریہ اہل قبور سے متعلق واضح ہو گیا کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند روایات مردی ہیں جن سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے جیسے "میت کی ہڈی توڑنا ایسا جیسا سگہ زندہ شخص کی ہڈی توڑنا۔" (یہ سماع موتی ثابت ہو رہا ہے۔ ناقل) ان روایات کی کوششی میں جناب کیلانی صاحب کا یہ دعویٰ محض غلط ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کی منکر ہیں۔

۳۔ حضرت عائشہؓ تو سماع موتی کی بھی قائل تھیں۔ اب یہ بعد از مرگ حضرت عمرؓ کے انھیں دیکھنے اور حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کا معاملہ تو اور بھی سخت ہے۔ پھر یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ اگر قبر پر منوں مٹی سے حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کو دیکھ سکتے ہوں تو معمولی کپڑے کا حجاب ایسی نظر کے لئے روک کیونکر بن سکتا ہے؟

۴۔ کیا حیات برزخ اور سماع موتی لازم و ملزوم ہیں؟

چودھری صاحب لے لکھا ہے کہ حضرت سیدہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حیات برزخ کی قائل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حیات برزخ کا کون قائل نہیں؟ حیات برزخ سے انکار تو عذاب و ثواب قبر کے انکار کے مترادف ہے۔ اور میں نے اپنے مضمون میں اس حیات برزخ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اس حیات برزخ سے یہ کب لازم آتا ہے کہ فوت شدہ لوگ ہم اہل دنیا کی باتیں سنتے اور ان کا جواب بھی دیتے بلکہ حاجت روائی اور شکل کشائی بھی کرتے ہیں؟

۵۔ سماع موتی یا احترام آدمیت؟ اب تک چودھری صاحب نے حضرت عائشہؓ کی جو تین مرویات پیش فرمائیں ان میں سے پہلی ابن ابی الدنیا کی ہے جو ناقابل احتجاج، دوسری روایت، جس میں حضرت عائشہؓ کا اپنے بھائی کو خطاب مذکور ہے، کے راوی ابن ابی ملیکہ ہیں نہ کہ حضرت عائشہؓ خود۔ اس روایت کو خواہ مخواہ حضرت عائشہؓ کی مرویات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اور تیسری روایت حضرت عمرؓ کی قبر سے حضرت عائشہؓ کے پردہ کرنے کی ہے جس پر ابھی بحث ہوئی۔ اور یہی بات میں بہ تکرار ذکر کر چکا ہوں کہ موضوع،

مولانا جبرائیل نے روح، عذاب قبر، سماح موتی سے متعلق مضمون کی دوسری قسط میں ایک جگہ لکھا ہے ”سجرت کی بات ہے کہ سماح موتی اور اسی طرح سلوک و تقصوت حقیقوں اور بالخصوص بریلوی طبقہ میں اتنا مقبول کیوں ہو گیا جبکہ امام ابو حنیفہ سماح موتی کے مخالف تھے۔ اور آگے امام صاحب سے متعلق واقعہ درج کیا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے سماح موتی کے متعلق نفی میں کچھ بھی ثابت نہیں اور جو روایات امام موصوف سے منسوب مجروح اور ضعیف روایات ہی سماح موتی کے جواز کا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ پھر ایسی روایات کو پیش کرنے کا فائدہ؟

اور اب سماح موتی کے جواز میں یہ چوتھی روایت پیش کر کے تو چودھری صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ع۔ جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی ہم بعد احترام چودھری صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ اس حدیث میں قابل ذکر بات احترام آدمیت ہے نہ کہ سماح موتی۔ احترام آدمیت یہ ہے کہ انسانی جسم انسان کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ خدا کی ملکیت ہے۔ کوئی شخص اپنی مرضی سے اپنے جسم کو نہ نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے، نہ خودکشی کرنے کا۔

۲۔ صرف انسان کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اسے درندے وغیرہ چیر بھاڑ نہ کھائیں۔ اور کسی جاندار کو مرنے کے بعد دفن کرنے کا حکم نہیں۔ ۳۔ کوئی شخص بھی کسی انسانی لاش میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ خود مرنے والا بھی ایسی وصیت نہیں کر سکتا۔ مثلاً یعنی کسی انسانی لاش کے اعضاء کاٹنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے میت کی ہڈی توڑنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب اگر اس حدیث سے بھی چودھری صاحب سماح موتی ثابت کرنا چاہیں تو ایسی سینکڑوں حدیثیں آپ کو اور بھی مل سکتی ہیں اور ہم پُر پہلے سے ایک نظر قائم کرنے کی وجہ سے نہ مانتے ”کا الزام بھی بدستور برقرار رہے گا۔

۳۳ امام ابو حنیفہ سے منسوب روایات:

روایات کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو میں نے ایک روایت درج کی تھی، لیکن اور بھی روایات ہیں۔ اب یہ روایات شاذ ہیں یا ناقابل اعتبار، اس کا

کی جاتی ہیں وہ شاذ اور ناقابل اعتبار ہیں۔  
 مسلک دیوبند کے نامور عالم مولوی رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں امام اعظم  
 رحمۃ اللہ علیہ سے اس باب میں کچھ مخصوص نہیں اور وہ روایات جو کچھ  
 امام صاحب سے آئی ہیں، شاذ ہیں۔ فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۲

### منکرین سماع کے امام اعظم اور سماع موتی

مولوی اسماعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی محدث دہلوی صراطِ مستقیم  
 ص ۱۶۶ پر رقمطراز ہیں ترجمہ مید احمد بریلوی کو سلسلہ چشتیہ کی نسبت حاصل  
 ہونے کا بیان یہ ہے کہ ایک دن آپ حضرت خواجہ خواجگان خواجہ  
 قطب الدین کاکی قدس سرہ کے مزار منور پر حاضر ہوئے اور مراقبہ کر کے  
 بیٹھ گئے۔ اسی اشار میں حضرت خواجہ کی روح پر فتوح سے ملاقات ہوئی اور  
 آنجناب نے سید صاحب پر بہت توجہ فرمائی اور اس توجہ کی وجہ سے  
 نسبت چشتیہ کے ابتداء نصیب ہو گئی۔

جناب منشی محمد جعفر تھانی مسمی لکھتے ہیں: ایک روز ارواح مقدس

فیصلہ تو حنفی حضرات ہی کریں جن کے لیے آپ کے اقوال بھی حجت ہیں۔ ہم نے  
 تو محض تائید کے طور پر یہ روایت درج کی تھی اور اس کا حوالہ حاضر خدمت ہے  
 دیکھیے (غرائب فی تحقیق المذاهب و تنہیم المسائل ملا محمد بشیر الدین)

حیرت تو اس بات پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی مشہور روایات جو سماع موتی کے  
 حق میں ہیں وہ تو پیش نہیں کی جاتی اور جو روایات مشہور ہیں انہیں شاذ کہہ کر اپنے  
 آپ کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ کیا تحقیق کا یہی انداز ہوتا ہے؟ سماع موتی کے رد میں

ہدایہ کی یہ عبارت بھی قابل غور ہے:

”وَكَذَلِكَ الْكَلَامُ وَالْخُحُولُ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنَ

الْكَلَامِ الْإِقْنَاءُ وَالْمَوْتُ يُنَافِيهِ (ہدایت ج ۳ ص ۳۸)

یعنی ”اسی طرح اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ میں تم سے نہ کلام کروں گا  
 نہ تمہارے پاس آؤں گا۔ پھر مرنے کے بعد اس کی قبر کی زیارت کی

جناب غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی و حضرت بہاؤ الدین نقشبند  
مترجمہ حال سید صاحب ہونیں اور قریباً ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان  
دونوں روحوں کے درمیان رہا ہر ایک روح ان دونوں روحوں میں سے  
سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایام  
تنازعہ کے دونوں روحوں کی بالاشترک جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ تب  
دونوں ارواح مقدسہ نے بالاشترک آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک ہر یک بنفس  
نفیس نحو توجہ قوی اور تاثیر زود آور فرمائی کہ اس ایک پہر میں نسبت ان دونوں  
خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔ سوانح احمدی ۶۵-۶۲

یہ روایت صراط مستقیم میں بھی درج ہے۔

اب یہ معجزہ تو کیلانی صاحب ہی حل فرمائیں گے کہ کیا سید صاحب پر  
توجہ ڈالنا اتنا ہی ضروری تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے ارواح قدستہ اسرارہم  
علیین اور اعلیٰ علیین کی نعمتیں اور بلند مقام چھوڑ کر ایک ماہ تک آپس میں  
جھگڑتی رہیں۔

کیا کیلانی صاحب یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اگر اَمَنَاتِ غَیْرِہِمْ  
اور وَہْمِہُمْ عَنْ دُعَائِہِمْ غَیْلُوْنَ کا اطلاق صرف فوت شدہ بزرگوں پر  
ہی ہوتا ہے تو سید احمد بریلوی مزار خواجہ قطب الدین علیہ الرحمۃ پر کیا لینے

یا کلام کیا تو قسم نہ ٹوٹے گی کیونکہ کلام سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے اور  
موت اس (افہام) سے روک دیتی ہے!

۳۵ معجزہ کس کے لیے؟

جو حضرات عالم بھی ہوں اور طریقت و سلوک میں بھی ان کا دامن الجھا  
ہوا ہو، ان کے ذہنی انتشار کی بھی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب  
محدث دہلوی، سید اسماعیل شہید، ابن حجر مکی وغیرہم سب اسی قبیل سے  
ہیں۔ اب ایک طرف شاہ ولی اللہ کی کتاب "البلد المبین" دیکھیے۔ اور  
دوسری طرف "انفاس العارفين" اسی طرح شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان"  
دیکھیے پھر صراط مستقیم، آپ کو یہ یقین ہی نہ آئے گا کہ یہ ہر دو کتب ایک ہی



گئے تھے۔ اگر پکارنے والے کی پکار کی خبر نہیں ہوتی تو وہاں سید صاحب کی ملاقات کس سے ہوتی تھی۔ اگر انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو شاہ نقشبند کو بخارا میں اور شاہ جیلان کو بغداد میں کیسے خبر ہوتی کہ ہندوستان میں کوئی سید احمد بریلوی نامی بھی شخص ہے چل کر اس پر تو خبر ڈالی جائے جس کی تشہیر بزم خود تو حیدر پرستوں کے امام ازل مولوی اسماعیل صاحب دہلوی نے صراطِ مستقیم میں کی ہے۔

آخر میں میں امید کرتا ہوں کہ ادارہ محدث جو کہ کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے تصویر کا دوسرا رخ شائع کرنے کی زحمت گوارا کرے گا تاکہ "محدث" کا مطالعہ کرنے والے حق و باطل کو خود پرکھ سکیں۔

مخلص: چوہدری محمد علی حنفی

مُصَنَّف کی لکھی ہوئی ہیں۔ دونوں کتابوں میں ایک دوسری کا مکمل رد و جواب ہوتا ہے۔ اگر آپ نے صراطِ مستقیم ملاحظہ فرمائی ہے تو تقویۃ الایمان بھی دیکھ لیجئے۔ ہمارے لیے ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی حجت کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کو بھی پرکھنے کا معیار بھی ہے کہ انہیں کتاب و سنت پر پیش کیا جائے اور "لَا تُحَدِّثُ مَا صَفَا وَدَعَّ مَا كَذَرَ" کے اصول پر عمل کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ سید احمد شہید کو حشمتیہ نسبت کیسے حاصل ہوئی الا قادیانے؟ آخر سید احمد میں کوئی خوبی تھی کہ بغداد سے پیران پیر کی رُوح تو جہ ڈالنے کے لیے آگئی اور دوسری طرف سے قطب الدین بختیار کاظمی کی رُوح تشریف لائی، پھر ان رُوحوں میں ایک ماہ تک تنازعہ ہوتا رہا۔ بالآخر سمجھوتہ کی صورت میں صلح ہو گئی اور سید احمد کو دونوں نسبتیں حاصل ہو گئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم ان واقعات کو درست سمجھتے ہوں تو پھر تو معتمد بھی سمجھیں ورنہ یہ معتمد کیسا اور ان کو مل کرنے کے ہم مکلف کیونکر؟ ایسے کثیف واقعات حالات کی حیثیت خواب کی سی ہوتی ہے جنہیں اہل طریقت و سلوک خود بھی حجت تسلیم نہیں کرتے!

(عبد الرحمن کیلانی)

